جلد (۹) عدد (۵)
ذی القعدہ ۱۳۵۵ھ

رجسٹرڈ نمبر آصفیہ ۱۲۰
رجسٹرڈ نمبر ایم ۲۹۵۰

۷۸۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی وحقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

قیمت سالانہ (صہ)

قیمت فی پرچہ (۸/)

الجہاد فی الاسلام

(تالیف)

ابوالاعلیٰ مودودی

اسلام کے جن مسائل پر مخالفین نے سب سے زیادہ حملے کئے ہیں اُن میں سے ایک مسئلہ جہاد بھی ہے اس مسئلہ پر ایسی شدومد کے ساتھ اعتراضات کیے گئے کہ بہت سے مسلمان بھی ان سے مرعوب ہو گئے اور انہوں نے دشمنوں کے اعتراضات کو رفع کرنے کے لیے خود اسلام کے احکام اور اس کی تعلیمات میں قطع و برید شروع کر دی۔ اسلام کے حامیوں کی جانب سے اس مسئلہ پر جو کچھ لکھا گیا وہ سب معذرت Apology کے انداز میں تھا جس سے صریح کمزوری اور مرعوبیت ظاہر ہوتی تھی مولانا شبلی مرحوم اور مولانا ابوالکلام آزاد نے البتہ اس مسئلہ کو صاف کرنے کی کوشش کی مگر پورا پورا حق ان کی تحریروں سے بھی ظاہر نہیں ہوا۔ ضرورت تھی کہ ایک مفصل کتاب اس موضوع پر لکھی جاتی جس میں جنگ کے متعلق اسلام کی تعلیم اور اس کے مقاصد اور احکام کو تفصیل کے ساتھ صاف صاف بیان کر دیا جاتا، اور دوسرے مذاہب اور قوموں کے اصول و قوانین جنگ سے مقابلہ کر کے ثابت کیا جاتا کہ اسلام کا جہاد اپنے مقاصد اور قواعد و ضوابط کے لحاظ سے سب پر فوقیت رکھتا ہے۔

الجہاد فی الاسلام نے اسی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ یہ کتاب معذرت کے انداز میں نہیں بلکہ اظہار حق کے انداز میں لکھی گئی ہے اور ضمناً اس میں ہندو مذہب، بودھ مت، مسیحیت، یہودیت اور قانون بین الاقوام International law پر ایسے مباحث بھی آ گئے ہیں جو ابھی تک اردو زبان کے لیے بالکل نئے ہیں عام طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ اس موضوع پر ایسی کوئی کتاب صرف اردو ہی بلکہ کسی مشرقی یا مغربی زبان میں نہیں لکھی گئی۔

ضخامت ۵۰۰ صفحات قیمت للعہ جلد (للعہ سکہ) انگریزی (للعہ) سکہ عثمانیہ (مجلد کی قیمت صہ سکہ انگریزی عہ سکہ عثمانیہ)

دفتر ترجمان القرآن سے طلب فرمائیے (یہ کتاب مکتبہ علمیہ چارمینار سے بھی مل سکتی ہے)

فہرست مضامین

ماہ ذی القعدہ ۱۳۵۵ھ جلد ۹ - عدد ۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

پچھلے سال عید اضحیٰ کے موقع پر پنجاب سے ایک اشتہار شائع ہوا تھا جس میں قربانی کو ایک بے محل بے معنی، فضول بلکہ مضر اور مسرفانہ رسم قرار دیا گیا تھا اور مسلمانوں کو مشورہ دیا گیا تھا کہ "ارض غیر ذی زرع کی اس نام نہاد سنت" کو چھوڑ کر اُس روپے کو جو قربانی میں ضائع کیا جاتا ہے قومی ادارات کی اعانت یتیموں اور بیواؤں کی پرورش اور بے روزگاروں کو روزگار فراہم کرنے میں صرف کریں۔ معلوم ہوا کہ یہ اشتہار ایک کثیر تعداد میں شائع کیا گیا ہے، اور اس جماعت نے اس چیز کو اپنی تبلیغ کا ایک مستقل جزو بنا لیا ہے کہ ہر سال بقرعید کے موقع پر مسلمانوں کو قربانی سے باز رہنے کی تلقین کریں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اب تک ان حضرات کی یہ کوشش کس قدر بارآور ہوئی ہے، لیکن تبلیغ کا جو انداز اختیار کیا گیا ہے، اور مسلمانوں کے نفسیات کا جو حال اس زمانہ میں ہم دیکھ رہے ہیں، اس کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم کو خوف ہے کہ ہزاروں مسلمان اب تک اس فریب میں مبتلا ہو چکے ہوں گے، اور اگر اس کا تدارک نہ کیا گیا تو آگے چل کر نہ معلوم اور کتنے مسلمان اس کے شکار ہوں۔

اس جماعت کی جو تحریریں ہماری نظر سے گذری ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ قربانی پر ان کو تین حیثیتوں سے اعتراض ہے:۔

ایک یہ کہ قربانی ان کے نزدیک رسوم جاہلیت میں سے ایک رسم ہے جس کو مولویوں نے محض

جہالت کی بنا پر ایک اسلامی طریقہ قرار دے لیا ہے۔ چنانچہ ان کے گروہ کا ایک مصنف قربانی کے متعلق اپنی تحقیق انیق ان الفاظ میں پیش کرتا ہے کہ "قربانی کی رسم تمام دنیا کی وحشی و مدنی قوموں میں تھی۔ آج سوائے مسلمانوں کے کوئی اس کو نہیں کرتا۔"

دوسرے یہ کہ معاشی حیثیت سے وہ اس کو نقصان دہ سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ جو روپیہ بکرے کی گردن پر چھری پھیرنے میں صرف کیا جاتا ہے وہ بالکل ضائع ہو جاتا ہے۔ اس کے بدلہ میں کوئی عقلی یا مادی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔

تیسرے یہ کہ ان کو قرآن میں قربانی کا حکم کہیں نظر نہیں آیا۔ رہی سنت تو اس سے انکار کر دینا ان کے نزدیک ہر چیز سے زیادہ سہل ہے، اور اس کو رد کرنے کا مسلک اختیار ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ اسلام کے جس حکم پر غیر قوموں کو اعتراض ہو یا جس حکم کی مصلحت خود اپنی سمجھ میں نہ آئے اس کو آسانی کے ساتھ دائرۂ دین سے خارج کیا جا سکے۔

چونکہ یہ اعتراضات ایسے لوگوں کی طرف سے پیش کیے گئے ہیں جو اپنے آپ کو مسلم کہتے ہیں اور قرآن کو حجت قطعی مانتے ہیں، اس لیے ہم قرآن ہی سے قربانی کے احکام بیان کریں گے اور قرآن ہی سے یہ بھی بتائیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے کن مصالح کی بنا پر عبادت کے مخصوص طریقوں میں قربانی کو شامل فرمایا ہے

قرآن مجید میں قربانی کے جو احکام دیے گئے ہیں ان کو تین اقسام پر منقسم کیا جا سکتا ہے۔

ایک قسم کی قربانی وہ ہے جو مناسک حج میں سے ایک خاص نسک ہے۔ اس کے متعلق ارشاد ہے:

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ	اور جب ہم نے ابراہیم کے لیے خانۂ کعبہ کی جگہ مقرر کی
...... وَاَذِّنْ فِى النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ	(تو حکم دیا کہ) ...... اور لوگوں میں حج کے لیے پکار دے
رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ	کہ ہر راہ دور و دراز سے تیرے پاس پیدل اور ہر طرح

كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ (الحج: ۴)

کی دبلی سواریوں پر آئیں یہ اس غرض کے لیے کہ وہ اپنے حق میں منافع دیکھیں اور چند معلوم دنوں میں ان جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے ان کو بخشے ہیں۔ پھر تم ان جانوروں میں سے خود بھی کھاؤ اور تنگ دست فقیر کو بھی کھلاؤ۔

جیسا کہ آیت کے الفاظ سے ظاہر ہو رہا ہے، حج قائم کرنے کا یہ حکم بنائے کعبہ کے ساتھ ہی ابراہیم علیہ السلام کو دیا گیا تھا اور اس کی غرض یہ بیان کی گئی تھی کہ لوگ یہاں آکر دین و دنیا کے منافع سے مستفید ہوں اور خدا کے نام پر قربانی کریں۔ پھر یہی فرض انہی مناسک کے ساتھ امت محمدیہ پر مقرر کیا گیا، کیونکہ یہ ملتِ ابراہیمی کی وارث ہے۔ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا (آل عمران: ۱۰) اور قربانی جس طرح ملت ابراہیمی کے مناسک حج میں شامل تھی اسی طرح امتِ محمدیہ کے حج میں بھی شامل رہی چنانچہ سورہ حج کے پانچویں رکوع میں امت محمدیہ کو خطاب کرکے ارشاد ہوتا ہے:۔

وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ۔

اور قربانی کے اونٹوں کو ہم نے تمہارے لیے اللہ کے شعائر میں سے قرار دیا ہے، تمہارے لیے ان میں بھلائی ہے پس تم ان کو صف بستہ کھڑا کرکے ان پر اللہ کا نام لو اور جب وہ پہلو کے بل گر جائیں تو ان میں سے خود بھی کھاؤ اور اُس کو بھی کھلاؤ (جو اللہ کے دیے ہوئے رزق پر) قانع ہے اور اُس کو بھی جو سوال کرتا ہے۔

دوسری قسم کی قربانی وہ ہے جو تمتع یا قران کے فدیہ میں، یا احصار کی صورت میں، یا ان جنایات کی جزا میں واجب ہوتی ہے جو مُحرم سے حالت احرام میں سرزد ہوں۔ اس کے احکام حسب ذیل ہیں:۔

(۱) وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ

اور خدا کے لئے حج اور عمرہ کو پورا کرو لیکن اگر تم روک دیے جاؤ تو جو کچھ ہدیہ کی قربانی میسر آئے بھیج دو اور اپنے سر نہ منڈواؤ جب تک کہ قربانی اپنے مقام پر نہ پہنچ جائے

(۲) فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيْضًا اَوْ بِهٖۤ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ۔

پھر جو کوئی تم میں سے مریض ہو یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو اور اس بنا پر اسے احرام کی قیود توڑنی پڑیں، تو وہ فدیہ میں یا تو روزے رکھے یا صدقہ دے یا قربانی کرے۔

(۳) فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِى الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ (بقرۃ : ۲۴)

پھر جو کوئی عمرہ کو حج سے ملا کر فائدہ اٹھائے تو جو کچھ قربانی میسر آئے کر دے اور اگر قربانی میسر نہ ہو تو حج کے دنوں میں تین دن کے اور واپس ہو کر سات دن کے روزے رکھے

(۴) يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ وَمَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْيًا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ (المائدہ : ۱۳)

اے اہل ایمان! شکار نہ مارو جب کہ تم حالت احرام میں ہو۔ اور تم میں سے جو کوئی جان بوجھ کر شکار مارے وہ اس کے بدلے جانوروں میں سے اسی سے ملتا ہوا جانور دے جس کا فیصلہ تم میں سے دو عادل آدمی کریں اور یہ قربانی کعبہ پہونچائی جائے۔

ان آیات میں قربانی کے جانوروں کو لفظ ہدی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ امام رازی نے اس لفظ کی نحوی تحقیق بیان کرتے ہوئے کہیں یہ لکھ دیا تھا کہ معنی الھدی ما یھدی الی بیت اللّٰہ عزوجل تقرباً الیہ بمنزلۃ الھدیۃ یھدیھا الانسان الی غیرہ تقربا الیہ۔ اتنی گنجائش سے فائدہ اٹھا کر مانعین قربانی نے بے تکلف فیصلہ کر دیا کہ ھدیٰ سے مراد قربانی نہیں بلکہ کوئی سامان ہے جو اللہ کے حضور پیش کر دیتا ہے۔ لیکن امام رازی نے اسی عبادت سے چند سطر آگے یہ بھی لکھا تھا کہ

فتقلید الایۃ حتیٰ یبلغ الھدی محلہ | آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جب تک ہدی اپنے مقام تک پہنچ کر
و ینحر فاذا نحر فاحلقوا | ذبح نہ کر دی جائے اس وقت تک سر نہ منڈواؤ۔

گرچو نکہ یہ عبارت مفید مطلب نہ تھی اس لیئے دور جدید کے محققین اسلام نے اس کی طرف توجہ نہ کی۔ اور یہ تو خیر امام رازی ہیں، انہوں نے خود اللہ تعالیٰ کی عبارت کو بھی قابل اعتناء نہ سمجھا جس نے سورۂ مائدہ والی آیت میں ھَدْیًا بَالِغَ الْکَعْبَۃِ کی تفسیر فَجَزَاءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ سے کر دی ہے۔ یہ آیت قطعی طور پر ھَدْی کے معنی متعین کر رہی ہے کہ قرآن میں جہاں یہ لفظ آیا ہے وہاں اس سے مراد قربانی ہی ہے نہ کہ کچھ اور۔

تیسری قسم کی قربانی وہ ہے جس کے ادا کرنے کا حکم نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ذریعہ سے عام مسلمانوں کو دیا گیا:۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ (الانعام:۲۰)

کہو اے محمد کہ میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت اللہ پروردگار عالم کے لیے ہے جس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اس کا حکم دیا گیا ہے اور میں فرمانبرداروں میں سب سے پہلے ہوں۔

اس آیت میں صلوٰۃ کے بعد نُسُک کا ذکر ہے جس کے معنی عبادت اور تطوع کے بھی ہیں اور قربانی کے بھی۔ قرآن میں یہ لفظ اسی دوسرے معنی کے لیے آیا ہے، چنانچہ سورۂ حج میں ہے۔

وَلِکُلِّ اُمَّۃٍ جَعَلْنَا مَنْسَکًا لِّیَذْکُرُوا اسْمَ اللّٰہِ عَلٰی مَا رَزَقَھُمْ مِّنْ بَھِیْمَۃِ الْاَنْعَامِ (۵)

اور ہر امت کے لیے ہم نے قربانی مقرر کی ہے تاکہ وہ ان جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے انہیں بخشے ہیں

اور سورۂ بقرہ میں ہے:۔

فَفِدْیَۃٌ مِّنْ صِیَامٍ اَوْ صَدَقَۃٍ اَوْ نُسُکٍ (۲۳)

تو اس کا فدیہ روزوں سے ادا کیا جائے یا صدقے سے یا قربانی سے۔

ان آیات سے نُسُك کے معنی متعین ہو گئے۔ اب دیکھیے کہ صلوٰۃ کے ساتھ نُسُك کے لیے بھی بِذٰلِكَ اُمِرْتُ (مجھے اس کا حکم دیا گیا ہے) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو صریحاً وجوب پر دلالت کرتے ہیں۔ پھر اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ۔ فرمایا گیا ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حکم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ تمام مسلمانوں کے لیے ہے۔ اسی بنا پر حضور نے تمام مستطیع مسلمانوں کو قربانی ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ اور اس کی تاکید فرمائی ہے۔ چنانچہ احادیث میں آیا ہے:

من کان لہ یسار فلم یضح فلا یقربن مصلانا — جو شخص استطاعت رکھتا ہو اور پھر قربانی نہ کرے وہ ہماری عیدگاہ کے قریب بھی نہ آئے۔

ان اول نسکنا فی یومنا ھذا الصلوٰۃ ثم الذبح۔ — ہمارے آج کے دن (عید اضحیٰ) میں ہماری پہلی عبادت نماز ہے، پھر ذبح۔

من صلی معنا ھذہ الصلوٰۃ فلیذبح بعد الصلوٰۃ۔ — جو ہمارے ساتھ یہ نماز (صلوٰۃ عید اضحیٰ) پڑھے وہ نماز کے بعد ذبح کرے۔

یہ ہیں قربانی کے متعلق قرآن کے صاف اور صریح احکام جن میں کسی شک و شبہ اور تاویل کی گنجائش نہیں۔ پڑھیے ان کو اور پھر داد دیجیے ان لوگوں کی جرأت کی جو ایک طرف تو قرآن پر سب سے بڑھ کر ایمان رکھنے کا دعویٰ رکھتے ہیں اور دوسری طرف یہ الفاظ علی الاعلان لکھتے اور شائع کرتے ہیں:

قُربانی کی رسم تمام دنیا کی وحشی اور مدنی قوموں میں تھی۔ آج سوائے مسلمانوں کے کوئی اس کو نہیں کرتا۔

"یہ کیونکر ضروری ہو گیا کہ غیر حاجی خواہ مخواہ اس بے محل اور مسرفانہ رسم میں حصہ لیں۔"

"وہ روپیہ جو بچے کی گردن پر چھری پھیرنے اور اسے زمین میں گاڑ دینے کے لیے صرف کیا جاتا ہے قومی اداروں کو ملنا چاہیے۔ وہ اس روپیے سے ہر سال ایک عظیم الشان

تجارتی بنک کھول سکتے ہیں قرآن حکیم اور دوسرے علوم کی توسیع واشاعت کرسکتے ہیں، اعتقادات واخلاق کی اصلاح کرسکتے ہیں، بیواؤں اور ناداروں کی مدد کرسکتے ہیں۔ اور ہزاروں نیکی کے کام کرسکتے ہیں بشرطیکہ تقلید کے جال سے آزاد ہو جائیں اور فضول بلکہ مضر رسوم کو چھوڑ دیں"

"افسوس ہے کہ سوائے نقل وتقلید کے آج تک کسی صاحب نے قربانی کے عقلی وتجربی فوائد پر روشنی نہیں ڈالی۔"

یہ قرآن سے کھلا ہوا معارضہ نہیں تو اور کیا ہے؟ قرآن ایک چیز کا حکم دیتا ہے اور آپ کہتے ہیں کہ پہلے اس کے عقلی وتجربی فوائد پر روشنی ڈالی جائے۔ قرآن ایک چیز کے متعلق کہتا ہے کہ لکم فیھا خیر" (تمہارے لیے اس میں بھلائی ہے) اور آپ اسے ایک فضول بلکہ مضر اور مسرفانہ رسم قرار دیتے ہیں۔ قرآن ایک چیز کو شعائر اللہ میں شمار کرتا ہے اور خبر دیتا ہے کہ اللہ نے اس کو مقرر کیا ہے، مگر آپ اس کے مقابلہ میں مغربی مستشرقین کی یہ تحقیق پیش فرماتے ہیں کہ یہ عہد جاہلیت کی ایک رسم تھی جس کو آج صرف مسلمانوں نے اختیار کر رکھا ہے۔

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

قرآن پر ایمان رکھنے کا دعویٰ اور پھر قرآن کے مقابلہ میں یہ جرأت! اگر ان دونوں کا اجتماع ممکن ہے تو ماننا پڑے گا کہ وجود شے اور عدم شئے کا اجتماع بھی ممکن ہے۔

قرآن کا یہ بھی ایک اعجاز ہے کہ جس قدر اعتراضات اس پر ہو سکتے ہیں ان کا جواب وہ خود ہی دے دیتا ہے۔ آئیے اب ذرا یہ بھی دیکھیے کہ قربانی کے حکم پر جو اعتراضات کیے گئے ہیں ان کے جواب میں قرآن کیا کہتا ہے:۔

جاہلیت میں جہاں غیر اللہ کے لیے رکوع وسجود ہوتے تھے اور غیر اللہ سے دعا اور استعانت

کی جاتی تھی، وہیں غیر اللہ کے لیے نذریں اور قربانیاں بھی ہوتی تھیں۔ عرب، ہندوستان، ایران، مصر، روم غرض کونسا ملک ایسا ہے جہاں معبودان باطل کے اصنام اور ہیکلوں پر قربانیاں نہ چڑھائی جاتی ہوں حتٰی کہ خدا پرست یہودی قوم بھی اس شرک میں مبتلا ہوئی اور بار بار اس نے بتوں پر قربانیاں چڑھانے کا ارتکاب کیا جس کی شکایت جگہ جگہ بائیبل کے عہد عتیق میں آتی ہے۔ قرآن میں بھی جاہلیت کی ان مشرکانہ رسموں کا ذکر ہے، مثلاً فرمایا۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا۔

اور انہوں نے کھیتی کی پیداوار اور مواشی میں سے اللہ کا ایک حصہ ٹھیرا دیا اور بخیال خود کہنے لگے کہ یہ اللہ کا ہے اور یہ ہمارے ٹھیرائے ہوئے شریکوں کا ہے۔

وَقَالُوْا هٰذِهٖۤ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ لَّا يَطْعَمُهَاۤ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ (الانعام ۱۶)

اور انہوں نے کہا کہ یہ جانور اور کھیتیاں ممنوع ہیں کہ ان کو اس شخص کے سوا کوئی نہیں کھا سکتا جسے ہم اپنے خیال کے مطابق کھلانا چاہیں۔ اور کچھ جانور ایسے ہوتے ہیں جن کی پشت پر سوار ہونا حرام کر دیا گیا ہے اور کچھ ایسے ہیں جن پر وہ اللہ کا نام نہیں لیتے۔ یہ ان کی افترا پردازی ہے (کہ ایسی جاہلانہ اور مشرکانہ باتوں کو خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں)۔

قرآن نے آکر جس طرح عبادت کی تمام دوسری صورتوں کا رخ غیر اللہ سے اللہ کی طرف پھیر دیا اسی طرح نذروں اور قربانیوں کا رخ بھی اُدھر سے ادھر پھیرا۔ اس نے ہدایت کی کہ مشرکین غیر خدا کے لئے رکوع و سجود اور قربانی کرتے ہیں، تم کہو کہ ہمارا رکوع و سجود اور ہماری قربانی صرف خدا کے لیے ہے قُلْ اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْيَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (الانعام: ۲۰) مشرکین اپنے جانوروں پر غیر خدا کا نام لیتے ہیں، تم ان پر صرف خدا کا نام لو۔ فَاذْکُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَیْهَا۔ وہ غیر اللہ کے

نام پر جانوروں کو چھوڑ دیتے ہیں، پھر نہ کسی کو ان پر سوار ہونے دیتے ہیں اور نہ ان کا گوشت کھانا یا کھلانا پسند کرتے ہیں تم اس جہالت کے جواب میں ہدی کے اونٹوں پر سواری کرو (لَكُمْ فِيهَا مَنَافِعُ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَا إِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيقِ ۔ الحج : ۴) قربانی کا گوشت کھاؤ اور اللہ کے بندوں کو کھلاؤ (فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ۚ : ۵) اس لیے کہ اللہ کو خون اور گوشت نہیں پہنچتا بلکہ تمہاری وہ خالص نیت پہنچتی ہے جس سے تم نے غیر اللہ کو ترک کر کے اللہ کی طرف رجوع کیا۔ لَن يَنَالَ اللَّهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلَٰكِن يَنَالُهُ التَّقْوَىٰ مِنكُمْ (الحج : ۵)۔

ہر شخص جو حکمت تشریع میں ادنیٰ بصیرت بھی رکھتا ہے، اس کے لیے یہ سمجھنا کچھ بھی مشکل نہیں کہ شرک و بت پرستی اور رسوم جاہلیت کو مٹانے کے لیے اس سے زیادہ کارگر کوئی تدبیر نہیں ہو سکتی کہ جن اقسام اور جن شکلوں کی عبادتیں مشرک قوموں میں رائج ہوں ان سب کو اللہ کے لیے مخصوص کر دیا جائے اور غیر اللہ کے لیے انہی سب کو ممنوع ٹھیرا دیا جائے۔ دنیا میں توحید فی العبادت اور اس کے ذریعہ سے توحید فی الاعتقاد کا قیام بغیر اس تدبیر کے ممکن ہی نہ تھا۔ یہ بات کچھ انسان کی فطرت ہی میں ہے کہ وہ جس کسی کو اپنا ملجا و ماوی سمجھتا ہے اس کے سامنے نذر و نیاز اور قربانی ضرور پیش کرتا ہے۔ چنانچہ بدو آفرینش سے آج تک دنیا میں کم و بیش اس طریق عبادت کا سلسلہ جاری ہے، حتیٰ کہ جہالت کی بنا پر خود مسلمان بھی اس قسم کے شرک فی العبادت میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ پس جب عبادت کے مختلف طریقوں میں سے ایک یہ طریقہ بھی نوع انسانی میں رائج ہے اور اس طریقہ کی طرف انسان میں ایک فطری میلان پایا جاتا ہے تو اخلاص فی العبادت کے لیے ناگزیر ہے کہ نذر و نیاز اور قربانی کو بھی غیر اللہ کے لیے ممنوع کر کے صرف اللہ کے لیے مخصوص کر دیا جائے۔ اس چیز کی عقلی و روحانی اور اخلاقی و مادی منفعت سطحی نظروں کو اگر محسوس نہ ہو تو یہ ان کی اپنی نظر کا قصور ہے۔ اللہ کے علم اور اس کی حکمت میں تو لوگوں کا مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ اور حُنَفَاءَ لِلَّهِ بن جانا اس سے بدرجہا زیادہ مفید ہے کہ ان کے لیے ایک نہیں دس لاکھ عظیم الشان بنک

نکل جائیں

قربانی کی ایک دوسری مصلحت بھی ہے جس پر قرآن سے روشنی پڑتی ہے۔

نوع انسانی کا ایک گروہ تو وہ تھا جس کا اوپر ذکر ہوا یعنی وہ جو خدا کے ساتھ اس کی مخلوق کو اعتقاد اور عبادت میں شریک ٹھہراتا ہے اور خدا کے بخشے ہوئے رزق میں سے غیر خدا کے سامنے نذریں اور قربانیاں پیش کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ایک دوسرا گروہ بھی ہمیشہ رہا ہے اور اب بڑھتا جا رہا ہے اور یہ وہ گروہ ہے جو سرے سے خدا کا قائل ہی نہیں، یا اگر قائل بھی ہے تو محض وجوب عقلی کی بنا پر اسطرح مانتا ہے جیسے ریاضی کے کسی فارمولے کو مانتا ہے۔ باقی رہا خدا سے کوئی تعلق تو وہ یہاں مفقود ہے۔ ان لوگوں کو یہ احساس تک نہیں کہ دنیا کے جس مال و متاع سے وہ فائدہ اٹھا رہے ہیں، جس زمین کی پیداوار کھا رہے ہیں، جس حشمت و ثروت سے لطف اندوز ہو رہے ہیں، جن حیوانات سے خدمت لے رہے ہیں، ان میں سے کسی چیز کے بھی وہ مالک نہیں ہیں، نہ کسی چیز پر ان کو ذاتی استحقاق حاصل ہے، بلکہ یہ خدا کی بخشش اور اس کا انعام ہے۔ یہ غفلت جس میں یہ کفار اور ملاحدہ مبتلا ہیں ان کو کیسے کیسے روحانی، اخلاقی، اور عملی مفاسد میں مبتلا کر رہی ہے اس کے بیان کی حاجت نہیں کہ آج ہر آنکھوں والا ان کا برائی العین مشاہدہ کر رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انہی مفاسد کا سدباب کرنے کے لیے مال و دولت اور زمین کی پیداوار میں قربانی کا قاعدہ مقرر کیا، تاکہ اللہ نے جو کچھ رزق عطا فرمایا ہے اس کا ایک حصہ انسان ہمیشہ خدا کی جناب میں نذر کرتا رہے اور یہ حقیقت اس کو یاد رہے کہ ہم ان چیزوں کے مالک اور مختار مطلق نہیں ہیں، بلکہ یہ بغیر کسی استحقاق ذاتی کے ہم کو عطا کی گئی ہیں اور ان میں عطا کرنے والے کی مرضی کے خلاف تصرف کرنے کا ہمیں کوئی حق نہیں۔

اس مضمون کی طرف آیات ذیل میں کس قدر لطیف اشارات کیے گئے ہیں:-

وَهُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡشَاَ جَنّٰتٍ مَّعۡرُوۡشٰتٍ	اور وہی ہے جس نے باغ اگائے ہیں جن میں سے کسی میں
وَّغَیۡرَ مَعۡرُوۡشٰتٍ وَّالنَّخۡلَ وَالزَّرۡعَ	بیلیں ٹٹیوں پر چڑھائی جاتی ہیں اور کسی میں نہیں

...كُلُوا مِنْ ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ وَآتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ ۖ وَلَا تُسْرِفُوا ۚ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ - وَمِنَ الْأَنْعَامِ حَمُولَةً وَفَرْشًا ۚ كُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ (الانعام : ۱۷)

چڑھائی جاتیں، اور اسی نے نخلستان اور کھیت پیدا کیے ہیں.... جب وہ پھل لائیں تو ان کے پھل کھاؤ اور فصل کاٹتے وقت اس کا (یعنی خدا کا) حق ادا کرو اور حد سے نہ گزرو کہ وہ حد سے گذرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور اسی نے جانوروں میں سے بعض بلند قامت پیدا کیے ہیں جو بار برداری کے کام آتے ہیں اور بعض پست قامت ہیں۔ اللہ نے تم کو جو کچھ دیا ہے اس میں سے کھاؤ اور شیطان کی پیروی نہ کرو۔

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُمْ مِنْ بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ ۗ فَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ فَلَهُ أَسْلِمُوا ۗ وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِينَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَالصَّابِرِينَ عَلَىٰ مَا أَصَابَهُمْ وَالْمُقِيمِي الصَّلَاةِ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ (الحج : ۵)۔

اور ہم نے ہر امت کے لیے قربانی مقرر کر دی ہے تاکہ وہ اللہ کا نام لیں ان جانوروں پر جو اس نے ان کو بخشے ہیں تمہارا خدا وہی ایک خدا ہے لہٰذا تم اس کی اطاعت میں سر تسلیم خم کرو۔ اے نبی ان عاجزی کرنے والوں کو خوش خبری سنا دو جن کا حال یہ ہے کہ جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل لرز اٹھتے ہیں اور جو مصیبتوں کے مقابلہ میں ثابت قدم رہتے ہیں اور جو نماز پڑھتے ہیں اور ہمارے بخشے ہوئے رزق میں سے خرچ کرتے ہیں۔

یہ رسم قربانی کی دوسری مصلحت ہے۔ اگر کسی کے پاس عقلی ترازو ہو تو وہ ایک پلڑے میں اس کو رکھے اور دوسرے پلڑے میں تمام قومی اداروں اور تجارتی بینکوں اور یتیم خانوں کو رکھ کر بتائے کہ ان میں سے کون زیادہ وزنی ہے۔

اب ذرا اقتصادی اعتراضات کو بھی جانچ لیجیے۔ قرآن کہتا ہے لَكُمْ فِيهَا خَيْرٌ اور وَكُلُوا مِنْهَا وَ

اَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَ الْمُعْتَرَّ۔ آپ کہتے ہیں کہ یہ اضاعت مال ہے۔ لاکھوں اللہ کے بندے جنہیں ہفتوں اور مہینوں اچھی قوت بخش غذا نصیب نہیں ہوتی، ان کو صدقہ اور ہدی اور نسک کے ذریعہ سے گوشت بہم پہنچانا آپ کی رائے میں اصول معیشت کے خلاف ہے۔ لاکھوں کسان اور گلہ بان جو سال بھر تک جانور پالتے ہیں اور بقرعید کے موقع پر ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں، ان کی روزی کا دروازہ بند کرنا، یہی آپ کے نزدیک بے روزگاروں کو روزگار مہیا کرنا ہے۔ ہزارہا غریب جن کو قربانی کی کھالیں مل جاتی ہیں اور ہزارہا قصائی جن کو ذبح کرنے کی اجرت مل جاتی ہے، یہ سب آپ کی قوم سے خارج ہیں اسی لیے آپ ان کی رزق رسانی کو فضول بلکہ مضر اور داخل اسراف سمجھتے ہیں۔ آپ کو تمام قومی ضروریات اور سارے فوائد ومنافع صرف اسی وقت یاد آتے ہیں جب خدا کے کسی حکم کی پابندی میں روپیہ صرف ہو رہا ہو، گویا کہ بینکوں کا قیام اور قومی ادارات کا فروغ اور اعتقاد واخلاق کی اصلاح اور یتیموں اور بیواؤں کی پرورش کا سارا کام صرف قربانی کی وجہ سے رکا پڑا ہے۔ ادھر یہ بند ہوئی اور ادھر قومی اداروں پر روپیہ برسنا شروع ہوا۔ اگر آپ کی تنظیم ایسی ہی مکمل ہے کہ سارے ہندوستان سے قربانی کا روپیہ جمع کرکے آپ ہر سال ایک تجارتی بینک کھول سکتے ہیں تو ذرا اسی تکلیف گوارا کرکے پہلے ہندوستان بھر کے سینما ہالوں اور قحبہ خانوں اور بدکاری واسراف کے دوسرے اڈوں پر اپنے ایجنٹ مقرر فرما دیجیے تاکہ مسلمانوں کا جس قدر روپیہ وہاں ضائع ہوتا ہے اس کو وہ قومی فنڈ میں وصول کرلیا کریں اس طرح آپ ہر سال نہیں ہر روز ایک تجارتی بینک کھول سکیں گے۔ پھر اگر آپ میں کچھ تعمیری قوت ہے تو قربانی کی تخریب کے بجائے آپ اسے زکوٰۃ کی تعمیری میں کیوں نہیں صرف فرماتے کہ تنہا اسی ایک چیز سے آپ وہ تمام قومی ضروریات پوری کرسکتے ہیں جن کی خاطر قربانی بند کرنے کی تبلیغ آپ نے شروع کی ہے۔

مقالات

سدّباب ذریعہ

اصُول تشریع میں سے ایک اصل عظیم

از افادات علامہ ابن قیمؒ رحمۃ اللہ علیہ

(۲)

(۳۸) شارع نے جمعہ اور عیدین اور استسقاء اور صلوٰۃ خوف میں ایک ہی امام کے تحت جمع ہونے کا حکم دیا۔ باوجودیکہ صلوٰۃ خوف میں دو اماموں کے پیچھے الگ الگ جمع ہونا جنگی ضروریات کے لحاظ سے زیادہ قرین مصلحت تھا، مگر شارع نے ایک ہی امام کے پیچھے نماز ادا کرنے پر زور دیا محض اس لیے تھا کہ تفرق اور اختلاف اور تنازع کا سدباب ہو اور اجتماع قلوب اور وحدت اور اتفاق کی صورتیں پیدا ہوں۔ یہ چیز شریعت کے اہم ترین مقاصد میں سے ہے اور اس نے ہر ممکن طریقہ سے اس مقصد کو نقصان پہونچانے والے ذرائع کی روک تھام کی ہے۔ حتٰی کہ نماز میں صفیں برابر کرنے کی تاکید بھی اسی لیے ہے کہ دلوں میں انتشار و اختلاف نہ پیدا ہو۔ اس کے شواہد اتنے کثیر ہیں کہ یہاں سب کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔

(۳۹) سنت یہ ہے کہ رجب کے مہینہ یا جمعہ کے دن کو روزے کے لیے مخصوص کر لینا مکروہ ہے اسی طرح شب جمعہ کو قیام کے لیے مخصوص کرنا بھی مکروہ قرار دیا گیا ہے۔ اس میں یہ مصلحت ہے کہ لوگ کسی ایسی چیز کو اپنے لیے مشروع نہ بنا لیں جس کو اللہ نے مشروع نہیں کیا ہے۔ اگر خدا کے حکم کے بغیر لوگ کسی مخصوص وقت یا زمانہ کی عبادت کو لازم کرنے لگیں تو اس سے اُنہی خرابیوں کا دروازہ کھلتا ہے جن میں اہل کتاب

مبتلا ہوئے۔

(۴۰) اہل ذمہ پر جو قیود عائد کی گئی ہیں وہ سب اس غرض کے لیے ہیں کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان لباس اور وضع قطع اور سواری وغیرہ میں تمیز ہو۔ مقصد یہ تھا کہ ظاہری مشابہت کی وجہ سے مسلمان اور غیر مسلم خلط ملط نہ ہو جائیں اور ایسا نہ ہو کہ غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کا سا معاملہ اور مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلموں کا سا معاملہ ہونے لگے۔ اسی فساد کا دروازہ بند کرنے کے لیے تمیز قائم رکھنے پر زور دیا گیا۔

(۴۱) نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے جب ناجیہ بن کعب الاسلمی کے ساتھ بیت اللہ کی طرف ہدی کے اونٹ روانہ کیے تو فرمایا کہ اگر ان اونٹوں میں سے کوئی اپنے مقام تک پہنچنے سے پہلے بیکار ہو جائے تو اس کو ذبح کر کے اس کے خون سے اس جوتی کو رنگ دینا جو اس کے گلے میں لٹکی ہوئی ہے،[1] اور اس کو لوگوں کے لیے چھوڑ دینا تم خود یا تمہارے رفقاء میں سے کوئی اس اونٹ کا گوشت نہ کھائے۔ اس کی مصلحت یہ بیان کی گئی کہ اگر مقام مقصود تک پہنچنے سے پہلے ان لوگوں کو ہدیہ کے اونٹوں کا گوشت کھانے کی اجازت دے دی جاتی تو ممکن تھا کہ وہ ان کی حفاظت اور ان کو چارہ پانی دینے میں غفلت کرتے اور انھیں کھا جانے کے لیے ایک بہانہ پیدا کر لیتے۔ لہٰذا مقام مقصود تک پہنچنے سے پہلے ان اونٹوں کا گوشت کھانا ان لوگوں کے لیے حرام کر دیا گیا، دراں حالیکہ وہ دوسروں کے لیے حلال تھا۔ غرض یہ تھی کہ جب یہ لوگ اپنے لیے انتفاع کا دروازہ بند پائیں گے تو اونٹوں کی حفاظت کریں گے اور اپنی حد تک انہیں سلامتی کے ساتھ منزل مقصود تک پہنچانے میں کوتاہی نہ کریں گے۔ یہ سدباب ذریعہ کا ایک نہایت لطیف طریقہ ہے جس سے شارع کے طرق تشریع پر خوب روشنی پڑتی ہے۔

(۴۲) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ جو شخص کوئی چیز پڑی پائے وہ اس پر کسی کو گواہ کرے حالانکہ

---

[1] عرب میں قاعدہ تھا کہ سفر کے موقع پر اونٹ کے گلے میں جوتی باندھ کر لٹکا دیتے تھے۔ اور یہ گویا عزم سفر کی علامت ہوتی تھی۔ اسی رسم کے لحاظ سے اسلام میں بھی جب کعبہ کی طرف ہدی کے اونٹ روانہ کیے جاتے تو انکے گلے میں جوتی باندھ دی جاتی

ایسا شخص امین ہی ہوگا مگر اس پر گواہ کرنے کو ضروری قرار دیا گیا تاکہ طمع اور اخفاء کے ذریعہ کا سد باب ہو جائے ممکن ہے کہ چیز اٹھاتے وقت اس کی نیت درست ہو اور بعد میں یہ دیکھ کر کہ کوئی اس راز سے واقف تو ہے نہیں، اس کی نیت میں فساد آجائے۔ پس جب وہ جلدی کر کے کسی کو اس پر گواہ کرلے گا تو لالچ اور اخفاء کا خطرہ جاتا رہے گا۔ یہ بھی سدّ باب ذریعہ کی لطیف ترین تدبیروں میں سے ہے۔

(۴۳) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو ما شاء اللہ و شاء محمد کہنے سے منع فرمایا اور اس خطیب کی مذمت کی جس نے یہ الفاظ کہے تھے کہ "جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا۔ وہ سیدھے رستے پر ہوگا اور جو ان دونوں کی نافرمانی کرے گا وہ بھٹک جائے گا"۔ یہ ممانعت محض اس غرض سے تھی کہ کہیں تشریک لفظی سے تشریک معنوی تک نوبت نہ پہنچ جائے۔ اللہ کے رسول کا مقصد شرک کی جڑ ہی کاٹ دینا تھا۔ اس لیے آپ نے ایسے الفاظ استعمال کرنے سے بھی منع فرما دیا جن سے شرک کی بُو آتی ہو۔ جس شخص نے ما شاء اللہ و رسولہ کہا تھا اس سے آپ نے فرمایا کہ تو مجھے خدا کا شریک ٹھیراتا ہے؟ گو اس کا قصد ایسا نہ تھا مگر درود و سلام ہو اللہ کے نبی پر کہ آپ نے لفظ میں بھی شرک کو جائز نہ رکھا تاکہ وہ فعل اور قصد میں شرک کرنے کا ذریعہ نہ بن جائے۔

(۴۴) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اگر امام بیٹھ کر نماز پڑھائے تو مقتدی بھی بیٹھ کر ہی نماز پڑھیں اس کا مقصد یہ تھا کہ مشابہت کفار کے ذریعہ کا سدّ باب ہو، اور کہیں مسلمانوں کا بھی وہی حال نہ ہو جائے کہ ان کے سردار بیٹھے ہیں اور وہ ان کے سامنے کھڑے رہا کریں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حکم تواتر کے ساتھ ثابت ہے اور اس کی علت بھی خود آپ ہی نے بیان فرمائی ہے۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ یہ حکم منسوخ ہے ان کے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں کیونکہ کوئی روایت اس کی ناسخ نہیں آئی۔

(۴۵) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رات کے وقت نماز پڑھنے والے کو حکم دیا کہ جب وہ اونگھنے لگے تو نماز چھوڑ کر سو جائے۔ فرمایا کہ اس حال میں نماز پڑھے گا تو ممکن ہے کہ وہ استغفار کرنے جائے اور

اٹھا اپنے حق میں برا کہنے لگے۔ لہذا اس کو سونے کا حکم دیدیا تاکہ اس کی نماز زیادہ گوئی کا ذریعہ نہ بن جائے۔

(۴۶) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا کہ کوئی شخص اپنے کسی مسلمان بھائی کی منگنی پر منگنی کا پیغام بھیجے یا اس کی بولی پر بولی دے یا اس کی بیع پر بیع کرے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ اس قسم کے مقابلے کہیں مسلمانوں میں آپس کے بغض وحسد اور دشمنی کے اسباب نہ بن جائیں۔ پس یہ احکام صرف انہی تین معاملات کے متعلق نہیں ہیں بلکہ مناصب اور عہدوں اور ملازمتوں میں ایک دوسرے کے خلاف جدوجہد کرنا بھی ناجائز ہے اور تمام ایسے مقابلے ممنوع ہیں جو ایک مسلمان اور دوسرے مسلمان کے درمیان عداوت اور بغض پیدا کرنے والے ہوں۔

(۴۷) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سوراخوں میں پیشاب کرنے سے منع فرمایا۔ اس کی غرض یہ بھی کہ یہ فعل کسی اذیت کا سبب نہ بن جائے۔ ممکن ہے کہ سوراخ کسی موذی جانور کا بل ہو اور وہ نکل کر کاٹ لے۔

(۴۸) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے راستوں پر اور سایہ کی جگہوں اور آب کشی کے مقامات پر بول وبراز کرنے سے منع فرمایا اور اس کی وجہ بھی خود ہی بیان فرمادی کہ "لعنت کیے جانے کے تین طریقوں سے بچو"۔ ایک دوسری حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ "دو لعنت کرنے والوں سے بچو"۔ لوگوں نے عرض کیا کہ وہ لعنت کرنے والے کون ہیں۔ فرمایا وہ جو لوگوں کے راستوں پر اور ان کی پناہ لینے کی جگہوں پر بول وبراز کرتے اور ان کی زبان سے لعنت کے الفاظ نکلواتے ہیں۔

(۴۹) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو حکم دیا کہ جب تک میں نماز کے لیے نکل نہ آؤں کھڑے نہ ہوا کریں۔ مقصد یہ تھا کہ نماز سے پہلے آپ کے انتظار میں کھڑے ہوتے ہوتے کہیں قیام لغیر اللہ کی رسم نہ پڑ جائے۔ اگرچہ اس وقت لوگ صرف نماز کے لیے کھڑے ہوتے تھے مگر امام کے نکلنے سے پہلے قیام کرنا ایک فساد کا ذریعہ تھا اور اس میں فائدہ کچھ نہ تھا۔

(۵۰) حضور نے نماز جمعہ سے متصل ہی کوئی نماز پڑھنے کی ممانعت فرما دی اور نماز جمعہ کے بعد دوسری کوئی نماز پڑھنے سے پہلے کوئی بات کرنا یا مسجد سے نکل آنا ضروری قرار دیا تاکہ یہ زیادت فی الفرض کا ذریعہ نہ بن جائے۔ سائب بن یزید کی روایت ہے کہ میں نے مقصورہ میں جمعہ کی نماز پڑھی اور جب امام نے سلام پھیرا تو میں نے اپنی جگہ کھڑے ہو کر پھر دوسری نماز شروع کر دی۔ اس کے بعد معاویہ رضی اللہ عنہ نے مجھے بلایا اور کہا کہ آیندہ ایسا نہ کرنا۔ نماز جمعہ کے بعد تا وقتیکہ کوئی بات نہ کرو یا مسجد سے نکل نہ جاؤ دوسری نماز نہ پڑھا کرو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی حکم فرمایا ہے۔

(۵۱) جس شخص نے اپنے گھر میں نماز پڑھ لی ہو۔ پھر مسجد میں آئے اور دیکھے کہ جماعت ہو رہی ہے تو اس کو حکم ہے کہ جماعت میں شریک ہو جائے۔ یہ اس لیے کہ اس کے نماز میں شریک نہ ہونے سے یا تو یہ بدگمانی ہوتی ہے کہ وہ نماز نہیں پڑھتا یا نماز نہ پڑھنے والوں کے لیے یہ ایک پردہ بن جاتا ہے۔

(۵۲) نماز عشا کے بعد آنحضرتؐ نے بات چیت میں لگ جانے یا جاگتے رہنے کو منع فرما دیا۔ آپ نماز عشا سے پہلے سونے کو بھی ناپسند فرماتے تھے۔ اور اس کے بعد بات چیت میں لگ جانے کو بھی۔ اس لیے کہ پہلے سو جانا نماز کے فوت ہو جانے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ اور بعد میں باتیں کرنا قیام لیل اور نماز صبح کے فوت ہو جانے کا سبب بن جاتا ہے۔ البتہ اگر اس مصلحت سے زیادہ بڑی کوئی مصلحت ہو تو جائز ہے مثلاً علمی خدمت میں مشغول ہو یا مسلمانوں کے مصالح سے متعلق کوئی کام ہو۔

(۵۳) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو حکم دیا کہ جب جماعت میں شریک ہوں تو مردوں کے سر اٹھانے سے پہلے سجدہ سے نہ اٹھیں۔ اور وجہ خود ہی بیان فرمائی کہ کہیں ان کی نظر مردوں کی شرمگاہ پر نہ پڑے۔

(۵۴) آپؐ نے اس سے منع فرمایا کہ کوئی شخص اپنے پاس والی مسجد کو چھوڑ کر دور کی مسجد تک جائے۔ ابن عمر سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے ہر شخص اپنے پاس والی مسجد میں

جائے اور اس سے گذر کر دوسری مسجد میں نہ جائے۔ یہ اس لیے کہ ایسا کرنا کسی مسجد کو ویران چھوڑ دینے اور اس مسجد کے امام کی بددلی کا ذریعہ نہ بن جائے۔ ہاں مسجد کا امام اگر نماز پوری طرح ادا نہ کرتا ہو یا بدعات کا ارتکاب کرتا ہو یا علانیہ فجور کا مرتکب ہو تو اس کو چھوڑ کر دوسری مسجد میں چلا جانا جائز ہے۔

(۵۵) آپ نے لوگوں کو حکم دیا کہ اذان کے بعد مسجد سے نماز پڑھے بغیر نہ نکلیں۔ یہ اس لیے کہ ان کا نکل جانا جماعت سے غفلت کا سبب نہ بن جائے۔ حضرت عمار نے ایک شخص کو اذان کے بعد مسجد سے باہر جاتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ اس نے ابوالقاسم کی نافرمانی کی۔

(۵۶) حضور نے جمعہ کے وقت مسجد میں ٹیک لگا کر بیٹھنے اور رومال سے گھٹنے اور کمر باندھ کر بیٹھنے کی ممانعت فرمادی جیسا کہ مسند امام احمد میں سہل بن معاذ نے اپنے والد سے روایت کیا ہے یہ اس لیے کہ ایسا کرنا نیند آجانے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

(۵۷) حضور نے عورتوں کو خوشبو لگا کر اور بخور استعمال کرکے اور مزین ہو کر مسجد میں آنے کی ممانعت فرمادی۔ یہ اس لیے کہ یہ سب چیزیں مردوں کے جذبات کو بھڑکانے والی اور ان کی طرف مائل کرنے والی ہیں۔ آپ نے اسی فساد کا سدباب کرنے کے لئے عورتوں کو حکم دیا کہ جب آئیں تو بالکل سادہ لباس میں بغیر کسی خوشبو اور زینت کے آئیں اور مردوں کے پیچھے کھڑی ہوں، اور اگر نماز میں کسی بات پر تنبیہ کرنا ہو تو سبحان اللہ نہ کہیں بلکہ ایک ہاتھ کی ہتیلی دوسرے ہاتھ کی پشت پر ماریں۔ یہ سب احکام سدباب ذریعہ کے قبیل سے ہیں۔

(۵۸) آپ نے فرمایا کہ کوئی عورت اپنے شوہر سے کسی غیر عورت کی صفت اس طرح نہ بیان کرے کہ گویا وہ اسے دیکھ رہا ہے۔ اس سے بھی مفاسد کا سدباب مقصود تھا کہ بسا کیں دولت از گفتار خیزد۔

(۵۹) آپ نے لوگوں کو سڑکوں پر بیٹھنے سے منع فرما دیا کہ یہ نظربازی اور محارم کی تاک جھانک اور شہدپن کا ذریعہ نہ بن جائے۔ لوگوں نے عرض کیا کہ کبھی ایسا کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ فرمایا راستہ کو اس کا

حق ادا کرو۔ پوچھا راستہ کا حق کیا ہے۔ فرمایا نظریں نیچی رکھو، راہ گیروں کو تکلیف دینے سے باز رہو۔ اور سلام کا جواب دو۔

(۶۰) آپ نے اس سے منع فرمایا کہ کوئی شخص کسی عورت کے ساتھ ایک مکان میں رات گذارے الا یہ کہ وہ اس کا شوہر یا محرم ذی رحم ہو۔ یہ اسلیے کہ کہیں اجنبیہ کے پاس رات گذارنا حرام میں مبتلا ہونے کا ذریعہ نہ بن جائے۔

(۶۱) آپ نے حکم دیا کہ جو چیز کسی مقام پر خریدی گئی ہو اس کو اسی جگہ فروخت نہ کیا جائے۔ فروخت کرنے سے پہلے اس کو وہاں سے منتقل کر دینا چاہیے۔ یہ اس لیے کہ اگر ایسا کیا گیا تو ممکن ہے کہ پہلا بائع دوسرے بائع کو نفع کماتے دیکھ کر اپنی بیع منسوخ کرنے اور مال واپس لے کر نئے خریدار سے معاملہ کرنے پر آمادہ نہ ہو جائے۔ اس حکم کو اس قاعدۂ کلیہ سے موکد کیا گیا کہ جب تک انسان کسی چیز کے نقصان کا ذمہ دار نہ ہو اس سے نفع کمانے کا حق نہیں رکھتا۔

(۶۲) آپ نے ایک بیع میں دو بیع کرنے سے منع فرمایا۔ ایک حدیث میں ایسی بیع کو ممنوع کہا گیا ہے جس میں دو شرطیں ہوں اور ان میں سے ناقص ترین شرط کسی ایک فریق کی طرف عائد ہوتی ہو تیسری حدیث میں اس کو ربوٰ سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس کی ممانعت ربا ہی کے سدباب کے لیے ہے مثلاً بائع نے اپنا مال خریدار کے ہاتھ سو روپے میں فروخت کیا۔ اور ادائے قیمت کے لئے مہلت دی پھر وہی مال اس سے دو سو روپے میں خریدا۔ یہ ایک بیع میں دو بیعیں ہوئیں۔ لینے والا جو رقم زائد لے گا وہ سود ہو گی۔ اسی طرح اگر بائع نے مال سو روپے میں قرض فروخت کیا تھا۔ پھر اسی مشتری سے ۵۰ روپے میں اس کو خرید لیا اور باقی پچاس اس پر قرض رکھے تو یہ بھی سود ہو گا۔ اور یہ طریقہ سود خواری کے بڑے ذرائع میں سے ہے۔ اس حدیث کو ایسی بیع پر محمول کرنا درست نہیں جس میں بائع نے خریدار کو اختیار دیا ہو کہ خواہ پچاس میں نقد خریدے خواہ سو میں قرض خریدے۔ ایسی بیع میں نہ ربا ہے، نہ دھوکا ہے

نہ مجہولیت ہے، نہ قمار ہے اور نہ مفاسد میں سے کوئی اور مفسدہ ہے، کیونکہ اس نے تو خریدار کو یہ اختیار دیا ہے کہ دونوں قیمتوں میں سے جو قیمت چاہے قبول کرے۔ اس قسم کا اختیار جس بیع میں دیا گیا ہو اس کی نوعیت اس بیع سے مختلف نہیں جس میں بیع کا معاملہ طے ہو جانے کے بعد خریدار کو تین دن کی مہلت دی جاتی ہے کہ خواہ مال رکھ لے خواہ واپس کر دے۔

(۶۳) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بچوں کو الگ الگ بستروں پر سلانے کا حکم دیا ہے۔ اور لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک ساتھ سلانے کی خاص طور پر ممانعت فرمائی ہے۔ یہ بھی سدّ باب ذرائع کی لطیف تدابیر میں سے ہے۔

(۶۴) حضور نے منع فرمایا کہ کوئی شخص اپنے حق میں خبثت نفسی (میرا نفس خبیث ہوا) کے الفاظ استعمال کرے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ ایسے مواقع پر لقست نفسی (میرا نفس بگڑ گیا) کہا کرو۔ مدعا یہ ہے کہ لوگوں کو بیہودہ الفاظ استعمال کرنے کی عادت نہ پڑے، کیونکہ الفاظ اور معانی میں جو مناسبت ہے اس کی بنا پر بُرے الفاظ استعمال کرتے کرتے ان کے معانی بھی نفس میں اثر کر جاتے ہیں۔ اور اسی لئے تم دیکھتے ہو کہ جو شخص کسی بُرے لفظ کا خوگر ہو جاتا ہے اس کے اوپر رفتہ رفتہ اس لفظ کی روح مسلط ہو جاتی ہے پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خُبث لفظی سے منع کر کے خبث معنوی کا دروازہ بند کرنا چاہا ہے۔

(۶۵) حضور نے فرمایا کہ کوئی شخص اپنے غلام اور لونڈی کو عبدی و اَمَتی (میرا بندہ یا میری بندی) نہ کہے بلکہ فتای و فتاتی (میرا چھوکرا یا میری چھوکری) کہا کرے۔ اسی طرح آپ نے لونڈی غلاموں کی نسبت سے آقا کے لیے رَبّ کا لفظ استعمال کرنے کی بھی ممانعت فرمائی۔ اگرچہ رب کے معنی مالک کے بھی ہیں جیسے ربّ الدار گھر کا مالک اور ربّ الابل اونٹ کا مالک لیکن انسان کے مقابلہ میں انسان کے لئے عبد اور ربّ کے الفاظ استعمال کرنے سے شرک فی اللفظ ہوتے ہوتے شرک فی المعنی کا خطرہ پیدا ہوتا ہے۔ لہذا آپ نے لونڈی غلاموں کے لئے عَبد اور اَمَۃ کے الفاظ کو فتیٰ اور فتاۃ سے بدل دیا۔ اور آقا کے لیے رب کے بجائے سید کا لفظ استعمال کرنے کی ہدایت فرمائی۔

(۶۶) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کو کسی محرم کے بغیر سفر کرنے سے منع فرمایا۔ اس سے بھی ذرائع فساد کا سد باب کرنا مقصود ہے۔

(۶۷) حضور نے فرمایا کہ اہل کتاب جو کچھ بیان کرتے ہیں اس کی نہ تصدیق کرو نہ تکذیب۔ اس لیے کہ ان کی تصدیق ممکن ہے کہ تصدیق باطل کا ذریعہ بن جائے اور ان کی تکذیب ممکن ہے کہ تکذیب حق کا سبب ہو جائے۔

(۶۸) حضور[۴] نے غلاموں کے نام افلح اور نافع اور رباح اور یسار رکھنے سے منع فرمایا۔ کیونکہ یہ الفاظ ایسے شگون لینے کے ذرائع بن سکتے ہیں جو ناجائز ہیں۔ اگرچہ افلح اور نافع وغیرہ سے یہاں لفظی معنی مراد نہیں ہوتے بلکہ غلام کا نام ہی مراد ہوتا ہے لیکن یہ الفاظ مکروہ معانی و مقاصد کا ذریعہ ہونے کی وجہ سے مکروہ قرار دیے گئے۔

(۶۹) حضور[۴] نے مردوں کو تنہائی میں اور شوہروں کی غیبت میں عورتوں کے پاس جانے سے منع فرمایا۔ ظاہر ہے کہ یہ بھی مفاسد کے سد باب کی خاطر ہے۔

(۷۰) حضور[۲] نے برّہ نام رکھنے سے منع فرمایا اس لئے کہ ایسا نام خود ستائی اور اپنی بزرگی آپ ظاہر کرنے کا ذریعہ بن سکتا ہے اگرچہ ابتدا میں اس سے محض تسمیہ مقصود ہوتا ہے۔

(۷۱) حضور[۲] نے شراب کو دوائً استعمال کرنے کی ممانعت فرمائی اگرچہ علاج کی مصلحت استعمال شراب کے مفسدہ سے بڑھ کر ہی کیوں نہ ہو۔ یہ اس لیے کہ شراب نوشی کی طرف رغبت پیدا ہونے اور اس کی نفرت دل سے نکل جانے کے جتنے اسباب ممکن ہیں، شریعت ان سب کا سد باب کرنا چاہتی ہے، لہٰذا اس نے مادّۂ مے نوشی کا قطعی استیصال کر دیا حتی کہ دوا کے لیے بھی شراب استعمال کرنے کی اجازت نہ دی۔

(۷۲) حضور[۲] نے اس سے منع کیا کہ تیسرے شخص کی موجودگی میں دو آدمی آپس میں گھسر پسر کریں یہ اسلیے کہ ایسا کرنا دوسروں کی دلشکنی کا سبب ہے اور اس سے آپس میں بدگمانیاں پیدا ہوتی ہیں۔

(۷۳) اللہ تعالیٰ نے ایسے شخص کے لیے لونڈی سے نکاح کرنا ممنوع کر دیا جو آزاد عورت سے نکاح کرنے

پر قادر ہو، بجز اس حالت کے کہ آدمی تنگدست ہو۔ یہ اس لیے کہ لونڈی سے نکاح کرنا اپنی اولاد کو کنیز زادگی کا داغ لگانا ہے۔ پھر جب اس فعل سے منع کیا گیا تو ایسی لونڈی سے بھی نکاح کرنے کی اجازت نہ دی گئی جو آئسہ ہو چکی ہو اور جسے حمل و ولادت کی امید نہ رہی ہو۔ کیونکہ جس چیز کی ممانعت کی جاتی ہے اس کے ذرائع کا دروازہ کھولنا شریعت کے اصول کے خلاف ہے۔ اسی مصلحت کی بنا پر امام احمد نے اسیر اور تاجر کو دارالحرب میں نکاح کرنے سے منع کیا ہے تاکہ اس کی اولاد غلامی کے خطرے میں نہ مبتلا ہو۔ انہوں نے ایک دوسری وجہ بھی بیان کی ہے اور وہ یہ ہے کہ شاید دارالحرب میں وہ شخص اپنی بیوی کی عصمت بچانے پر قادر نہ ہو سکے۔

(۴۷) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی مرضین آدمی کو تندرست آدمی کے پاس لے جانے سے منع فرمایا۔ اس لیے کہ ایسا کرنا یا تو اس تندرست کو بھی بیماری میں مبتلا کرنے کا ذریعہ بن جائے گا یا وہم اور خوف کی وجہ سے اس کے لیے سبب اذیت ہوگا۔

(۵۷) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو دیار ثمود میں داخل ہونے سے روک دیا اِلّا یہ کہ روتے ہوئے جائیں۔ یہ اس لیے کہ وہ ایک معذب قوم کا مقام تھا۔ اندیشہ تھا کہ وہاں فرحان وشادان جانا کسی آفت میں مبتلا ہو جانے کا سبب نہ بن جائے۔

(۶۷) حضورؐ نے انسان کو کسی ایسے شخص پر نظر رکھنے سے منع کیا جو اس سے زیادہ مال دار ہو اور اس سے بہتر لباس پہنے ہوئے ہو۔ اس لیے کہ اللہ نے جو نعمت خود اس کو دے رکھی ہے کہیں وہ اس کو حقیر نہ سمجھنے لگے اور یہ اس کے لئے ذریعہ ہلاکت بن جائے۔

(۷۷) حضورؐ نے گھوڑیوں پر گدھے ڈالنے کی ممانعت فرمائی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ گھوڑوں کی نسل قطع کرنے اور گھوڑوں کی تعداد کم ہونے کا ذریعہ ہے۔ اور اگر یہ حدیث صحیح ہے کہ آپ نے گھوڑے کا گوشت کھانے سے منع کیا۔ تو اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ گھوڑوں کی تعداد کم ہونے سے ان مصالح کو نقصان نہ پہنچے جو غذا سے زیادہ اہم ہیں۔ بعض غزوات میں آپ نے لوگوں کو گھوڑوں کی پیٹھوں پر ضرب لگانے سے منع

کیا کہ وہ بیکار نہ ہو جائیں۔

(۷۸) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے برا خواب دیکھنے والوں کو اپنے خواب کا ذکر کرنے سے منع کیا کیونکہ یہ کہیں اس خواب کے مرتبۂ وجود لفظی سے وجود خارجی میں منتقل ہونے کا ذریعہ بن جائے۔ یہ سدِ ذرائع کی ایک لطیف ترین مثال ہے۔ غور کرو تو معلوم ہوگا کہ عموماً برائیاں ورجات ظہور میں طبقاً بعد طبق منتقل ہوتی ہیں۔ پہلے وجود ذہنی ہوتا ہے۔ پھر وہ بیان میں منتقل ہو جاتا ہے اور آخرکار اس کا ظہور خارج میں ہو جاتا ہے۔

(۷۹) حضور[۳] سے پوچھا گیا کہ شراب سے سرکہ بنایا جا سکتا ہے یا نہیں۔ آپ نے فرمایا نہیں۔ حالانکہ آپ نے ایسے سرکہ کی اجازت دے دی تھی جو خمر سے بلا تخلیل حاصل ہوا ہو۔ پس تخلیل کی ممانعت صرف اس لیے تھی کہ آپ شراب رکھنے کے کسی بعید ترین ذریعہ کو بھی آزاد نہ چھوڑنا چاہتے تھے۔ ممکن تھا کہ تخلیل کی اجازت سے فائدہ اٹھا کر لوگ شراب اپنے پاس رکھنے لگیں اور یہ کسی وقت اس کے استعمال کا محرک ہو جائے۔

(۸۰) حضور نے ننگی تلوار لینے اور دینے سے منع فرمایا تاکہ یہ کسی برائی کا سبب نہ بن جائے۔ ہو سکتا ہے کہ شیطان اس وقت آدمی کے ہاتھ سے کھیلنے لگے اور اس کو کسی فتنہ میں مبتلا کر دے۔

(۸۱) حضور نے مسجد میں نیزے لے کر آنے والوں کو حکم دیا کہ ان کے پھل ہاتھ میں رکھو تاکہ ان کی نوک سے کسی مسلمان کو اذیت نہ پہنچ جائے۔

(۸۲) آپ نے شیاع (تفاخر بالجماع) کی ممانعت فرمائی کیونکہ اس سے فساد پھیلتا ہے اور شرعی بے ہودگی کے علاوہ یہ نفوس میں تحریک کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایسی باتیں سن کر کسی شخص کے جذبات بھڑک اٹھیں اور وہ حلال کا ذریعہ نہ رکھنے کی وجہ سے حرام میں مبتلا ہو جائے۔ اسی بنا پر کہا گیا ہے کہ مجاہرین (یعنی وہ لوگ جو اپنے معاصی کا چرچا کرتے ہیں) اللہ کی عافیت سے خارج ہیں۔

(۸۳) حضور نے ٹھیرے ہوئے پانی میں پیشاب کرنے سے منع فرمایا، کیونکہ اس سے پانی نجس ہوتا ہے اس باب میں پانی کی کثرت اور قلت کی کوئی تمیز نہیں اس لیے کہ کثیر پانی میں اگر بول و براز کرنے کی اجازت

دی جائے تو کسی وقت قلیل پانی کو بھی نجس کر دیا جائے گا۔ پھر اس کی ممانعت عام ہے کیونکہ اگر ہر شخص یہی خیال کرے کہ میرا تھوڑا سا پیشاب اتنے پانی کو کیا گندہ کرے گا تو پیشابوں کے تواتر سے پاک پانی نادر الوجود ہو جائے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ ممانعت صرف اس پانی کے لیے ہے جو قلتین سے کم ہو یا جس کو کھینچ لینا ممکن ہو، وہ حکمت تشریع سے ناواقف ہیں۔ شارع حکیم کا مقصد تو ٹھیرے ہوئے پانی کو نجاست سے پاک رکھنا ہے۔ اس کے لیے پانی کی مقدار مقرر کرنا اور کسی خاص مقدار سے زیادہ پانی میں پیشاب کی اجازت دینا گویا پانی کے خزانوں کو پیشاب گاہ بنا دینا ہے، جو شارع کی حکمت سے ابعد ہے۔ شارع نے کسی جگہ بھی قلتین سے زیادہ پانی میں یا ایسے پانی میں جس کو کھینچنا ممکن ہو، پیشاب کی اجازت نہیں دی، بلکہ عمومیت کے ساتھ ٹھیرے ہوئے پانی میں پیشاب کرنے سے منع کیا ہے، خواہ کم ہو یا زیادہ۔

(۸۴) حضورؐ نے مسافر کو دشمن کے ملک میں قرآن لے جانے سے منع فرمایا ہے اور خود ہی اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ شائد اس طرح قرآن دشمنوں کے ہاتھ پڑ جائے اور وہ اس کی توہین کریں۔

(۸۵) حضورؐ نے احتکار[1] کی ممانعت فرمائی ہے۔ کیونکہ اس سے لوگوں کو یا محتاج کو تنگی ہوتی ہے، اور یہ گرانیِ اجناس کا ذریعہ ہے۔ اسی بنا پر ایسے احتکار کی ممانعت نہیں ہے جو لوگوں کے لیے ضرر رساں نہ ہو۔

(۸۶) حضورؐ نے اس سے منع کیا کہ کوئی شخص اپنی ضرورت سے زیادہ پانی کا استعمال دوسروں پر بند کرے۔ اور خود ہی وجہ یہ بیان فرمائی کہ کہیں یہ زائد از ضرورت چارے کو بھی روکنے کا ذریعہ نہ بن جائے۔ مطلب یہ ہے کہ جو شخص اپنا پانی تک دوسروں کے جانوروں کو نہ پینے دے گا وہ اس کے ارد گرد کی چراگاہ میں ان کے جانور بھی نہ چرنے دیگا۔ اور یہ تنگ دلی لوگوں کے لیے سختی و مصیبت کا سبب بن جائے گی۔

(۸۷) حضورؐ نے حاملہ عورت پر حد زنا جاری کرنے کی ممانعت فرمائی تاکہ یہ اس کے پیٹ کے بچے کی ہلاکت کا سبب نہ بن جائے۔

---

[1] غلہ وغیرہ کے ذخائر اس غرض سے روک رکھنا کہ قیمتیں چڑھنے کے وقت ان کو فروخت کریں گے۔

(۸۸) حضورؐ نے جذام کے مریضوں کی طرف نظر جما کر دیکھنے سے منع فرمایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کہیں یہ بیماری دیکھنے والے کو بھی نہ لگ جائے۔ اہل طبیعت اس کے معترف ہیں کہ بعض بیماریاں محض نظر کے واسطے سے لگ جاتی ہیں۔ ایک عالم طبیعیات نے خود مجھ سے بیان کیا کہ میرا ایک عزیز آنکھوں کا معالج تھا جب اس نے اپنے پیشہ کا آغاز کیا تو کچھ عرصہ بعد اُس کی آنکھیں دکھنے آگئیں۔ اچھا ہونے کے بعد اس نے پھر اپنا کام جاری کیا اور پھر اس کی آنکھیں دکھیں۔ اس طرح کئی مرتبہ وہ بیمار ہوا۔ اس تجربہ سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ طبیعت نظر کے واسطے سے بھی منتقل ہوتی ہے۔ چونکہ وہ بار بار آشوب چشم کے مریضوں کی آنکھیں دکھیتا تھا اس لئے مریضوں سے آشوب کی طبیعت اس کی آنکھوں میں منتقل ہوگئی۔ اگرچہ اس قسم کا انتقال ہونے کے لئے پہلے سے اس شخص میں اس مرض کی استعداد ہونا لابُد ہے مگر یہ کون جانتا ہے کہ اس میں کس مرض کی استعداد ہے اور کس کی نہیں۔

(۸۹) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ملاقات کے وقت جھکنے اور سر و کمر کو خم کرنے کی ممانعت فرمائی ہے۔ آج بہت سے لوگ جو عالم کہلاتے ہیں مگر سنت کا علم نہیں رکھتے، اس سنت کی مخالفت میں اتنا مبالغہ کر رہے ہیں کہ انسانوں کے سامنے رکوع کی حد تک جھک جانے کو بھی جائز رکھتے ہیں۔ اور ایک جماعت تو اپنے زندہ اور مردہ شیوخ کے سامنے اس قدر جھکتی ہے کہ سجود کے قریب قریب پہنچ جاتی ہے۔ ایک تیسرا طائفہ ہے جو اس کو جائز رکھتا ہے کہ ایک شخص خدا بن کر بیٹھے اور لوگ اس کے سامنے کھڑے ہوں۔ ان تینوں گروہوں نے نماز کی ایک ایک چیز لے لی ہے۔ ایک نے رکوع لیا۔ دوسرے نے سجود اور تیسرے نے قیام۔ حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی انسان کے سامنے سر اور کمر کو محض خم کرنا بھی جائز نہ رکھا تاکہ یہ تعبد لغیر اللہ کا سبب نہ بن جائے۔ حتّٰی کہ آپ نے اس کی بھی اجازت نہ دی کہ جو شخص بیٹھ کر نماز پڑھ رہا ہو۔ اس کے پیچھے لوگ کھڑے ہو کر نماز پڑھیں۔ گو یہ قیام خدا کی عبادت ہی کے لیے ہے۔ مگر آپ کی حکیمانہ نظر دیکھ رہی تھی کہ مخلوق کی تعظیم اور عبودیت میں قیام کرنے کا بھی ایک خفیف ترین شائبہ اس کے

اندر موجود ہے اس لیے آپ نے اس تک کا قلع قمع کر دیا۔

(۹۰) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سونے چاندی اور غلات وغیرہ کے ہم جنس مبادلہ میں حکم دیا ہے کہ مبادلہ دست بدست ہو اور تقابض سے پہلے فریقین کے جدا ہونے کی ممانعت فرمادی تاکہ اس کو مہلت اور تاجیل کا ذریعہ نہ بنا لیا جائے جو ربا کی اصل ہے۔ ایک ہی مجلس میں تقابض کی شرط اسی لئے لگائی گئی ہے کہ لوگ ربا کے قریب بھی نہ پھٹکنے پائیں۔ پھر حضور نے ہم جنس اشیاء کے مبادلہ میں مثل بمثل کی شرط بھی لگائی اور واجب کیا کہ مقدار میں ایک شئے دوسری شئے سے زائد نہ ہو حتیٰ کہ اچھی اور بری کھجوروں کا مبادلہ بھی مساوی مقدار میں کیا جائے۔ یہ سب اسی لیے ہے کہ ربا النسیۂ کا دروازہ نہ کھلنے پائے۔ کیونکہ جب لوگ اس زیادتی تک سے پرہیز کریں گے جو مال کی بہتری اور خوبی وغیرہ کے مقابلہ میں ہو تو وہ بدرجۂ اولیٰ اس زیادتی سے بھی پرہیز کریں گے جس کے مقابلہ میں بجز مہلت کے اور کچھ نہ ہو۔ ربا الفضل کی تحریم میں یہی حکمت ہے جو اکثر لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو گئی ہے، حتیٰ کہ بعض متاخرین نے صاف ہی کہدیا کہ ربا الفضل کے حرام ہونے کی علت ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ حالانکہ شارع نے خود ہی علت بیان فرما دی ہے کہ اسے ربا النسیۂ کے ذریعہ کا سدباب کرنے کے لیے حرام کیا گیا ہے۔ چنانچہ حدیث میں یہ الفاظ موجود ہیں کہ فانی اخاف علیکم الرما والرما ھو الربا (یعنے مجھے خوف ہے کہ کہیں تم ربا میں مبتلا نہ ہو جاؤ) پس تحریم ربا کی دو قسمیں ہیں۔ ایک نوع تو وہ ہے جو اصل مفسدہ کی وجہ سے حرام کی گئی ہے۔ یعنی ربا النسیۂ اور دوسری نوع وہ ہے جو محض وسیلہ اور ذریعہ ہونے کی وجہ سے حرام کر دی گئی ہے۔ جو لوگ شارع حکیم کی حکمت کو نہیں سمجھتے ان کے لیے لازم ہے کہ ربا الفضل سے تعبدِ محض کے طور پر باز رہیں۔

لہ مطلب یہ ہے کہ جب ایک ہی جنس کی دو چیزوں کا مبادلہ ہو تو اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے کا معاملہ ہونا چاہیے۔ اگر قبضہ لینے سے پہلے فریقین ایک دوسرے سے جدا ہو گئے تو بیع فاسد ہو جائے گی۔ اس باب میں یہاں تک سختی کی گئی ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے جدا ہو جانے کو بھی جائز نہیں رکھا گیا۔ کیونکہ اگر اس کو جائز رکھا جائے تو مہلت کا دروازہ کھلتا ہے اور سود کی جڑ یہی مہلت ہے۔

(۹۱) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کی بہت سی انواع کو سد باب ذریعہ کی خاطر ممنوع قرار دیا ہے مثلاً نکاح بلاولی کہ وہ زنا کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ ایک زانی ایک عورت کو اس بات پر راضی کر لیتا ہے کہ وہ اپنا نفس دس درہم کے عوض اس کے حوالہ کر دے اور اس پر اپنے دوستوں کو یار اہ چلتوں میں سے دو آدمیوں کو پکڑ کر گواہ کر لیتا ہے۔ اگر اس کو جائز رکھا جائے تو ایسے نکاح اور زنا میں کیا فرق رہ جاتا ہے۔ اسی طرح حضور نے ایسے نکاح کو بھی حرام قرار دیا ہے۔ جو محض حلالہ کرنے کے لئے کیا جائے۔ کیونکہ اس میں عورت کو بیوی بنانے کا تو ابتدا ہی سے ارادہ نہیں ہوتا۔ وہ محض اس سے ایک مرتبہ یا حد سے حد چند مرتبہ جماع کرنے کے لیے عقد کرتا ہے، اور یہ حقیقۃً زنا ہی ہے۔ اگرچہ صورت بدلی ہوئی ہے۔ نکاح مُتعہ کی تحریم بھی اسی لیے ہے کہ متعہ کرنے والا محض ایک خاص مدت تک اپنی خواہش نفسانی پوری کرنے کے لیے عورت سے معاملہ کرتا ہے۔ ان سب انواع نکاح کو ذریعۂ سفاح کا انسداد کرنے کے لیے حرام کیا گیا ہے۔ اور صرف ایسے نکاح کو جائز رکھا گیا ہے جس میں زوجین ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کا قصد رکھتے ہوں، اور جس میں ولی اور شاہد موجود ہوں اور جس کو اعلان کے ساتھ کیا جائے۔

(۹۲) حضور نے صدقہ کرنے والے کو اپنا صدقہ کیا ہوا مال خریدنے سے منع فرمایا ہے اگرچہ وہ اس کو بازار میں بکتا ہوا ہی کیوں نہ پائے یہ اس لئے کہ انسان کے دل میں اس چیز کو واپس لینے کی کوئی خواہش تک باقی نہ رہے جو اس کے پاس سے خدا کے لیے نکل چکی ہے۔ جب کوئی شخص بعوض بھی اپنے صدقہ کو واپس نہ لے سکتا ہو تو ظاہر ہے کہ وہ بلاعوض اسے واپس لینے سے بدرجۂ اولیٰ باز رہے گا، اور اس کے نفس کو اس مال سے کوئی تعلق باقی نہ رہے گا جس کو وہ راہ خدا میں دے چکا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی بات ثابت ہے کہ صدقہ کیے ہوئے مال کو خریدنا مطلقاً ممنوع ہے۔ اور غور کرنے والا سمجھ سکتا ہے کہ اگر یہ ممنوع نہ ہو تو ایک شخص یہ حیلہ کر سکتا ہے کہ پہلے اپنے مال کا صدقہ کسی فقیر کو دے، پھر اس کو کم قیمت دے کر خرید لے۔ فقیر بیچارہ یہ دیکھ کر کہ کچھ تو ہاتھ آتا ہے، اس کو بخوشی یا مجبوراً بیچ دیگا۔ مگر اللہ عالم الاسرار

ہے۔ اور اس کی نظر میں اصلی قیمت مال کی نہیں بلکہ اس نیت کی ہے جس کے ساتھ مال دیا گیا ہے۔

(۹۳) حضور نے پھل پکنے سے پہلے ان کی بیع سے منع فرمایا کیونکہ پھل پکنے سے پہلے خراب ہو سکتے ہیں اور ایسی بیع خریدار کا مال ناحق کھانے کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ اس ذریعہ کا سدباب کرنے میں مزید تاکید یہ کی گئی کہ اگر جائز طور پر خریدنے کے بعد پھل خراب ہو جائیں تو خریدار کے حق میں آفت ناگہانی کا حکم لگایا جائیگا تاکہ وہ سوچ سمجھ کر معاملہ کرے اور اس پر ظلم نہ ہو' نہ اس کا مال بلا حق کے کھایا جائے

(۹۴) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہاری تقدیر کا لکھا جب پیش آئے تو یہ نہ کہا کرو کہ ہم ایسا کرتے تو ایسا ہوتا۔ وجہ یہ بیان فرمائی کہ ایسی باتیں شیطان کو اپنا کام کرنے کا موقع دیتی ہیں۔ وہ تو یہی چاہتا ہے کہ تم پر رنج اور شرمندگی اور مقدور سے ناراضی مسلط ہو' اور تم یہ خیال کرو کہ ایسا اور ایسا کرنے سے تقدیر کو ٹالا جا سکتا تھا۔ ایسی باتیں رضا و تسلیم اور تفویض و تصدیق کو ضعیف کرنے والی ہیں۔ درحقیقت مسلمان کو یہ سمجھنا چاہیے کہ جو کچھ خدا چاہے گا وہ ہوگا اور جو نہ چاہے گا وہ نہ ہوگا جب دل اس اعتقاد سے ذرا منحرف ہوتا ہے تو شیطان کے لیے عمل کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ پس یہ ذرا سا جملہ کہ "ہم ایسا کرتے تو ایسا ہوتا" اگرچہ مجرد لفظ ہی ہے، لیکن چونکہ اس سے بڑے مفاسد کی ابتدا ہوتی ہے اس لیے اس کی ممانعت کر دی تاکہ دل میں وہ خیالات راہ ہی نہ پائیں جو ایمان کے منافی اور عمل شیطان کے لیے راستہ کھولنے والے ہیں۔

(۹۵) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے لوگوں کا کھانا کھانے سے منع کیا جو محض ایک دوسرے کے مقابلہ میں شان دکھلانے اور فخر و مباہات کی خاطر دعوتیں کرتے ہوں۔ اسی طرح ایسے لوگوں سے مال خریدنے کی بھی ممانعت کی جو ایک دوسرے کے مقابلہ میں قیمتیں گھٹا کر فروخت کرتے ہوں تاکہ گاہک ان کے مخالف کی دوکان پر نہ جائے۔ اس ممانعت میں متعدد وجوہ سے ذریعۂ فساد کا انسداد ہے

(۹۶) قرآن میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو عذاب دیا جنہیں آزمانے کے لیے سبت کے

دن مچھلیاں پکڑنے سے منع کیا گیا تھا۔ سبت ہی کے دن مچھلیاں کثرت سے آتی تھیں اسلیے وہ جمعہ کے روز گڑھے کھودنے لگے تاکہ سبت کے روز مچھلیاں ان میں جمع ہو جائیں اور اتوار کے روز وہ انھیں پکڑ لیا کریں۔ اللہ نے ان لوگوں کو بندروں اور سوروں کی صورت کا بنا دیا۔ غور کرو کہ اس عذاب کی وجہ کیا تھی۔ یہی نا کہ انہوں نے نافرمانی کے لیے ایک جائز فعل کو ذریعہ بنا کر خدا کو دھوکہ دینا چاہا۔ ان کا اصل مقصد سبت ہی کی مچھلیاں پکڑنا تھا، جس سے انھیں منع کیا گیا تھا، مگر انہوں نے حیلہ یہ کیا کہ ایک جائز صورتِ فعل اختیار کی، یعنی جمعہ کو جال لگانا اور اتوار کو مچھلیاں پکڑنا۔ لہٰذا ان کو نافرمان قرار دیا گیا، کیونکہ اصل اعتبار صورتِ فعل کا نہیں بلکہ قصد فاعل اور حقیقتِ فعل کا ہے۔ جو لوگ ذریعہ کے انسداد کو اہمیت نہیں دیتے اور صرف صورتِ فعل ہی پر نظر رکھتے ہیں ان کے مذہب کی رو سے اصحاب السبت کا یہ فعل حرام نہ تھا، اسی وجہ سے وہ بھی ایسے حیلوں کو جائز رکھتے ہیں، مثلاً یہ کہ اگر احرام سے پہلے جال لگایا گیا ہو اور اس میں مچھلیاں پھنس جائیں تو احرام کھولنے کے بعد ان کو پکڑنا جائز ہے۔

(۹۷) امام احمد کا بیان ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فتنہ کے زمانہ میں اسلحہ فروخت کرنے کی ممانعت فرمائی ہے۔ لاریب کہ یہ بھی اعانت علی المعصیت کے ذریعہ کا انسداد ہی کرنے کے لیے ہے۔ جو لوگ سدّ ذریعہ کے قائل نہیں وہ اس کو بھی جائز رکھتے ہیں حالانکہ یہ بیع دراصل تعاون علی الاثم و العدوان ہے۔ اور ایسے تمام بیوع اور اجارات اور ہر قسم کے معاملات اسی ذیل میں آتے ہیں جو خدا کی معصیت میں مددگار ہوں، مثلاً کفار اور باغیوں اور رہزنوں کے ہاتھ اسلحہ فروخت کرنا، اور غلام کو ایسے شخص کے ہاتھ فروخت کرنا جو اس سے برا کام کرتا ہو یا کراتا ہو، اور مکان یا دکان کو رنڈیوں کے لیے کرایہ پر دینا، اور ان لوگوں کے ہاتھ چراغ اور سامان زینت فروخت کرنا یا کرایہ پر دینا جن کے متعلق معلوم ہے کہ خدا کی معصیت میں ان کو استعمال کریں گے، اور ایسے شخص کے لیے

انگور نچوڑنا جس کے متعلق معلوم ہے کہ شراب بنائے گا۔ یہ اور ایسے ہی تمام امور دراصل اللہ کی نافرمانی میں مدد دینے کے مترادف ہیں۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کے لیے انگور کا رس نکالنے اور نکلوانے والوں دونوں پر لعنت فرمائی ہے۔ جو لوگ سد ذریعہ کے قائل نہیں ہیں ان کے مذہب کی رو سے لازم ہے کہ رس نکالنے والے پر لعنت نہ کی جائے اور ہر شخص کے لیے رس نکالنا جائز ہو اور کہا جائے کہ عقد میں قصد و نیت کا کوئی اعتبار نہیں، اور ذریعہ معصیت خود معصیت نہیں۔ وہ علانیہ کہتے ہیں کہ ہم صرف ظاہر کو دیکھتے ہیں، باطن کا تعلق خدا سے ہے مگر ان کے اس مسلک اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں کھلی ہوئی منافات ہے۔

(۹۸) آنحضرت نے امراء مسلمین سے لڑنے اور ائمہ پر خروج کرنے سے منع فرمایا جب تک کہ وہ نماز قائم کرتے رہیں، اگرچہ وہ ظالم اور ستمگر ہوں۔ یہ اسی لیے تھا کہ ان سے جنگ کرنا ان کے ظلم وجود سے بڑھ کر فساد اور شر کا سبب بن جائیگا۔ جیسا کہ فی الواقع ہوا۔ جب کبھی ان کے خلاف جنگ کی گئی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو ظلم وہ کرتے تھے ان سے بدرجہا زیادہ ظلم و ستم برپا ہوئے اور آج تک امت پر ان فتنوں کے باقیات مسلط ہیں۔ اسی فساد کا دروازہ بند کرنے کے لیے حضور نے فرمایا کہ جب دو خلیفوں کی بیعت کی جائے تو ان میں سے ایک کو قتل کر دو۔

(۹۹) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن کو سات حرفوں میں سے صرف ایک حرف پر جمع کیا تاکہ مختلف لہجوں اور زبانوں کا استعمال قرآن میں اختلاف کا ذریعہ نہ بن جائے۔ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس مسئلہ میں ان سے اتفاق کیا۔

یہاں ہم تفاولاً صرف اتنی ہی مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں کہ اللہ کے اسماء حسنیٰ بھی (۹۹) ہیں۔

سلیم کے نام...... دوسرا خط

از جناب چوہدری غلام احمد صاحب پرویز

سلیم تم درست کہتے ہو کہ جمعۃ الوداع کے دن جامع مسجد میں قریب پچاس ہزار مسلمانوں کا اجتماع ہوگا۔ اور تم نے یہ بھی ٹھیک کہا کہ اس عظیم الشان گروہ کے ایک آواز پر جھکنے اور اٹھنے کی ہم آہنگی کا نظارہ بڑا دلکش تھا۔ اس کی دلکشی تو اس سے بھی ظاہر ہے کہ بڑے بڑے سیاح آپ کے اس "تماشے" کی تصویریں لینے بڑی بڑی دور سے آتے ہیں۔ اور ان کے لیے مسجد کے سب سے زیادہ موزوں مقام پر اُن حضرات کی طرف سے سہولتوں کے سامان بہم پہنچائے جاتے ہیں جن سے اگر تصویر کشی کا فتویٰ مانگا جائے تو کبھی تکفیر سے ورے بات نہ کریں۔ یہ تو تھا جملۂ معترضہ۔ لیکن سلیم! میں پوچھتا یہ ہوں کہ مسلمانوں کے اس قدر ہجوم میں کتنے انسان تھے کہ جسمانی حرکات کی ہم آہنگی کے ساتھ ساتھ ان کے قلوب بھی ہم آہنگ ہوں۔ اسلام اتحاد خیال کے بعد کہ جسے اصطلاح میں ایمان کہا جاتا ہے، اتحاد عمل کا سبق سکھانے آیا تھا۔ اور اس اتحاد کی بہترین شکلیں اسی قسم کی اجتماعی عبادات تھیں لیکن ذرا غور کر کے بتاؤ تو سہی کہ اس ظاہری اتحاد عمل میں حقیقی اتحاد عمل کا جذبہ کس حد تک کارفرما تھا؟ اسے بھی چھوڑ دو۔ یہ بتاؤ کہ اس ہزار ہا کے مجمع میں کتنے مسلمان تھے کہ جسم کے رکوع و سجود کے ساتھ ساتھ ان کے قلوب بھی مالک حقیقی کے حضور جھکتے چلے جا رہے ہوں۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ مولوی صاحبان ادھر سے ادھر صف بہ صف وعظ کہتے پھرتے تھے معلوم ہوتا تھا کہ امت کی نجات و سعادت کے دروسے کھلے جا رہے ہیں۔ وہ یہ بتاتے تھے کہ صفیں کس طرح سیدھی کرنی چاہئیں، دونوں پاؤں کے درمیان فاصلہ کس قدر ہونا چاہیے۔ کندھے کے ساتھ کندھا نہ ملنے سے کس قدر عذاب ہوگا۔ لیکن سلیم! ان میں سے کسی ایک نے بھی یہ بتایا کہ مسلمانوں تم یہاں جمع

کس غرض کے لیے ہوئے ہو؟ نماز تمہیں کیا پیغام دیتی ہے؟ نماز کا جماعت کے ساتھ ادا کرنا کیوں ضروری ہے؟۔ ایسے ایسے شاندار اجتماعات سے حقیقی مفہوم کیا ہے؟ یہ اٹھنا بیٹھنا کیا ہے؟ صفیں کیوں سیدھی ہونی چاہئیں؟ امام صرف ایک ہی کیوں ہوتا ہے؟ اور اس کی ایک آواز پر بلاچون وچرا سب کو ایک ہی حرکت کیوں کرنی پڑتی ہے؟ وہ غلطی بھی کرتا ہے تو اس کی غلط متابعت اس وقت کیوں ضروری ہوتی ہے؟ فوٹو اتارنے والے سیاح جب اس نظارہ کو اپنے الفاظ میں بیان کرتے ہیں تو مسلمانوں کے اس ضبط و انضباط۔ اس عملی ہم آہنگی کی بیحد تعریف کرتے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس حقیقت سے اب وہ بھی آشنا ہو چکے ہیں کہ یہ ضبط و انضباط، یہ عملی ہم آہنگی یہ اتحاد عمل اب صرف جسموں تک ہی محدود ہے۔ قلوب پر ان کا کچھ اثر نہیں۔ یہ ایک رسم ہو کر رہ گیا ہے اس کی روح بالکل بھلائی جا چکی ہے۔ آج دنیا کی ہر قوم اپنی تمام قوت اس بات کے لیئے صرف کر رہی ہے کہ ان کے افراد میں اتحاد عمل پیدا ہو۔ ان کی حرکات میں ہم آہنگی اور یگانگت پیدا ہو جائے۔ وہ ایک "امام متفق علیہ" کی آواز پر سب کے سب جھک جائیں اور سب کے سب اٹھ کھڑے ہوں اب اندازہ لگاؤ کہ جس قوم میں یہ سب باتیں بلا محنت وکاوش خود بخود موجود ہوں، اور اس سے نتیجہ کچھ برآمد نہ ہو، تو اس کو تم بے روح نہ کہوگے تو اور کیا کہوگے۔ اور پھر یہ بھی دیکھو کہ دنیا یہ ضبط و انضباط تلاش کر رہی ہے محض اس لیے کہ اس کی جوع الارضی کی تشنگی کمزوروں کے خون ناحق سے بجھ جائے لیکن مسلمانوں میں یہ ہم آہنگی، یہ اطاعت امیر اس لیے پیدا کی جاتی ہے کہ ان کے قلوب مزکّیٰ ہوں۔ ان کی روح میں بالیدگی آئے۔ وہ ہر وقت اللہ کو سامنے رکھیں۔ ان کا جھکنا ہو تو اس کے لیے۔ ان کا اٹھنا ہو تو اس کے لیے ان کی قوتیں کمزوروں کی حفاظت کے لیے ہوں۔ ان کی طاقتیں ضعیفوں کے حقوق کی نگہداشت میں کام آئیں۔ سلیم! اندازہ لگاؤ کہ رمضان کا آخری جمعہ کس قدر نفسیاتی کیفیتیں اپنے اندر رکھتا ہے۔ مہینہ بھر سے خدا کے بندوں میں جسمانی اور روحانی انقلاب پیدا کیا جا رہا تھا ان کو ٹھیٹھ سپاہیانہ

زندگی کا خوگر بنایا جا رہا تھا۔ ان کی نگاہوں کو تمام خیانتوں سے۔ ان کے دلوں کو تمام خباثتوں سے پاک کیا جا رہا تھا۔ ان سے حلال و طیب چیزیں بھی چھڑائی گئی تھیں کہ نفس شریر کبھی حرام و خبیث چیزوں کی طرف مائل ہی نہ ہو۔ اس کے بعد انہیں ایک جگہ جمع کیا جاتا ہے کہ وہ جائزہ لیں اپنے تمام اعمال کا اور محاسبہ کریں اس انقلاب کا جو ان کے اندر پیدا ہوا ہے۔ اطاعت امیر۔ مرکزیت۔ اتحاد عمل۔ تالیف قلوب کے مظاہرہ سے تجدید ایمان کریں۔ اور اٹھتے اور جھکتے بار بار اس شاہنشاہ کے حضور اس بات کی عملی شہادت دیں کہ۔

اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔ میری نماز۔ میری قربانیاں۔ میرا مرنا۔ میرا جینا سب اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔

سلیم! تم سمجھتے ہو کہ مزکّیٰ و مقدس انسانوں کی یہ جماعت دنیا میں کیا کچھ نہ کر سکتی ہوگی۔ ذرا اسلام کی تاریخ کے زرین اوراق الٹ کر دیکھو کہ سنہ ۲ھ میں سب سے پہلے روزے فرض ہوئے اور اسی رمضان کی سترہ تاریخ کو ان روزہ دار نمازیوں کی قوتوں کا امتحان بھی لیا گیا۔ مورخین یورپ کہتے ہیں کہ واٹرلو کی لڑائی نے یورپ کی تاریخ کا نقشہ بدل دیا لیکن ان کی تنگ نگاہیں ذرا اور آگے بڑھتیں تو دیکھ لیتیں کہ سنہ ۲ھ کے رمضان میں بدر کے مقام پر جو جنگ ہوئی اس نے دنیا کی ہسٹری کو بدل دیا۔ باطل و ظلمت کی تمام قوتیں اپنے تمام ساز و سامان سے آراستہ ہو کر اس بات کے لیے میدان میں نکل آئیں کہ دنیا سے حق و نور کو (معاذ اللہ) مٹا دیا جائے۔ مسلمانوں کی کل کائنات، قریب تین سو نفوس، جو ابھی ابھی اپنا گھر چھوڑ کر، دوسروں کے ہاں آکر پناہ گزیں ہوئے تھے۔ بے سر و سامان بظاہر بے کس و بے بس۔ ان کے لئے اب زندگی اور موت کا سوال تھا نہیں! حق و باطل کے غلبہ کا سوال تھا۔ ان روزہ داروں نے کیا کیا۔ اپنے بچوں تک کو لے کر میدان میں آگئے۔ سلیم! ذرا اس موقع کی نزاکت کا اندازہ لگاؤ۔ اس کا احساس اس لئے کرو کہ خود سرور دو عالم نے اس لق و دق صحرا میں نہایت عجز و خشوع سے اپنے خدا کو پکارا

اور کہا کہ اے اللہ! تیرے بندوں کی یہ مٹھی بھر جماعت، محض تیرے نام کی حفاظت کے لیے سربکف اس میدان میں جمع ہو گئی ہے۔ اگر آج یہ سب شہید ہو گئے تو دنیا میں تیرا نام لینے والا کوئی باقی نہ رہے گا۔ مانگنے والے نے ابھی اپنی دعا بھی ختم نہ کی تھی کہ دینے والے نے اسے اپنی رحمتوں سے یوں نوازا۔ کہ

إِنِّي مُمِدُّكُم بِأَلْفٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُرْدِفِينَ۔ میں تمہاری مدد کے لیے ہزار فرشتے لگاتار بھیجوں گا۔

فرشتے تمہاری مدد کے لیے آئیں گے اور وہ آکر کیا کریں گے؟

فَثَبِّتُوا الَّذِينَ آمَنُوا ۚ سَأُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ۔ (انفال) مسلمانوں کے دلوں کو مضبوط رکھو میں کفار کے دل میں ان کی وحشت طاری کر دوں گا۔

فی الحقیقت وہ ملائکہ جنہوں نے خلیفہ فی الارض کو جھک کر سلام کیا تھا۔ ان کو واقعی ان کی یوں ہی مدد کرنی چاہیے تھی نہیں سلیم! اللہ تعالیٰ نے یہی نہیں کہہ دیا کہ تم مزے سے بیٹھے رہو سب کچھ ہمارے فرشتے ہی کر دیں گے۔ بلکہ اس وقت ایک مکمل ضابطہ سامنے رکھ دیا کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ ذرا غور سے سنو کہ وہ ضابطہ کیا ہے۔ وہ ہدایات کس قسم کی ہیں۔ فرمایا۔

"اے ایمان والو! جب تم کفار سے میدان جنگ میں آمنے سامنے آؤ۔ تو ان کو پیٹھ مت دکھاؤ۔ یاد رکھو جو ان کو آج کے دن پیٹھ دکھائیگا۔ اِلّا اس بات کے کہ وہ پینترا بدلتا ہو۔ یا اپنی فوج میں آنے کے لیے ایسا کرتا ہو سو اُس پر اللہ کا غضب ہوگا۔ اور اس کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔ اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے۔

سلیم سنتے ہو کہ مخاطب کون سے مسلمان ہیں! اور غور کرتے ہو کہ اپنی قوم کا ساتھ چھوڑ دینا دشمن کے مقابلہ میں پیٹھ دکھا دینا۔ کس قدر جرم عظیم ہے!

پھر فرمایا۔

"اے ایمان والو! اللہ کی اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ اور اس سے مت پھرو۔

درانحالیکہ تم سن رہے ہو۔ اور ان لوگوں کی طرح مت ہو جانا جنہوں نے کہدیا کہ ہم نے سن لیا حالانکہ وہ سنتے نہیں تھے۔ اے مسلمانو! اللہ اور اس کے رسول کی آواز پر لبیک کہو۔ جس وقت وہ رسول تم کو اس بات کی طرف بلائے جو زندگی بخشنے والی ہے۔"

سمجھتے ہو کہ خدا کی راہ میں "مرجانے" کا نام کیوں "زندگی" رکھا جاتا ہے؟ اس عظیم الشان حقیقت پر غور کرو، موت اور حیات کے سربستہ راز تم پر منکشف ہو جائیں گے۔

پھر فرمایا۔

"اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول سے خیانت نہ کرو۔ اور اپنی امانات (کے لوٹانے) میں خیانت مت کرو اور تم جانتے ہو۔ یاد رکھو۔ تمہارے مال اور اولاد فتنہ ہیں۔ اور اللہ کے ہاں تو بہت بڑا اجر ہے۔ اے ایمان والو! اگر تم اللہ سے ڈروگے تو وہ تمہیں ایک امتیازی زندگی عطا کرے گا۔ اور تمہاری فروگذاشتوں سے درگذر کریگا۔ اور تم کو معاف کردے گا۔ اللہ بڑا فضل والا ہے۔"

سلیم! تمہیں معلوم ہے کہ یہ امانات کیا ہیں جن میں خیانت کرنے سے منع کیا گیا ہے؟ دوسری جگہ ارشاد ہے کہ "اللہ نے مسلمانوں سے ان کے اموال اور خود ان کی جانیں خرید لیں بعوض جنت کے ...... الآیہ"۔ تم دنیا کے قاعدہ سے واقف ہو۔ فرض کرو جب تم کسی دکاندار سے کوئی چیز خریدو اور اس سے کہو کہ بھائی! میں ذرا آگے جاتا ہوں۔ واپسی پر یہ چیز لیتا جاؤں گا۔ تو اب یہ چیز اس بیچنے والے کے پاس امانت ہو گئی۔ جب خریدنے والا آئے اور مانگے۔ تو اس وقت حسن معاملہ کا تقاضا ہے کہ بیچنے والا بلاپس وپیش وہ چیز اصل مالک کے سپرد کر دے۔ اب غور کرو کہ اللہ نے کسی خاص مومن کی نہیں بلکہ ہر ایک مومن کا مال اور جان خرید رکھا ہے اور جب تک وہ اسے طلب نہ کرے، اس عبد مومن کے پاس وہ بطور امانت رکھا ہے جس وقت بھی وہ مانگے، اسے حاضر کر دینا چاہیے۔ پھر دیکھو

کہ اس کی قیمت کا بیعانہ یہاں کیا ملتا ہے! ایک امتیازی زندگی سلیم! ڈھونڈو۔ آج مسلمانوں کی وہ امتیازی زندگی کہاں ہے!!

پھر فرمایا:۔

"اے مسلمانو! جب تم کسی جماعت کے سامنے آجاؤ۔ تو ثابت قدم رہو۔ اور اللہ کو شدت سے یاد کرو۔ تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ اور اللہ کی اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اور آپس میں مت جھگڑو۔ ورنہ تمہارے حوصلے پست ہو جائیں گے۔ تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ ثابت قدم رہو۔ اللہ ایسے ہی لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے" (انفال)

سلیم سنتے ہو یہ ہدایات کیا ہیں! یہ زندگی کا پیغام ہیں۔ یہ اسلام کی روح ہیں۔ یہ ایک عبد مومن کی تمام عبادات کا مفہوم ہیں۔ یہ صرف ۲ھ کے بدر کے موقع کے وقتی احکام نہیں ہیں بلکہ قیامت تک، جب تک حق و باطل میں آویزش کا امکان ہے، جب تک خیر و شر کا مقابلہ ہے، اس وقت تک کے لیے تمام مسلمانوں کے لیے ایک دستور اساسی ہے۔ ایک لائحۂ عمل ہے۔ یہی ہدایات ہیں جن کی یاد کے لیے رمضان کے روزے، اور ان روزوں کا جمعۃ الوداع ہے۔

سلیم! اب تم خود فیصلہ کرو کہ نتائج پیدا کرنے والے ان تین سو مسلمانوں کے روزے تھے اور نمازیں تھیں یا ان پچاس ساٹھ ہزار کا رسمی اجتماع کہ جس میں مقصد و روح کی طرف کسی کی توجہ نہ ہو تو بھائی! تاوان کیوں بنتے ہو۔ کیا تم اتنی سی بات بھی نہیں سمجھ سکتے کہ افطاری کے گولے[1] قلعہ کی دیواریں نہیں ڈھا سکتے۔ ہر چند ان کا دھماکا۔ اور دھواں اصلی گولوں ہی کا سا ہوتا ہے۔

عید کے متعلق میں نے تمہیں پچھلے سال بتایا تھا کہ یہ نزول قرآن کریم کی یادگار میں اسلامی جشن ہے

---

[1] دہلی میں افطار اور سحری کے وقت جامع مسجد سے گولے چھوڑے جاتے ہیں غالباً اور شہروں میں بھی ایسا ہوتا ہوگا۔

تم دنیا بھر کی قوموں کے مختلف جشن و مسرت کے تیوہاروں کو دیکھو ان میں یا تو کسی انسان کی یادگار کا جذبہ پنہاں ہوگا۔ یا مظاہر فطرت کی نیرنگیوں کی تقریب۔ لیکن تم سمجھتے ہو کہ انسانوں کی یادگاریں مٹ سکتی ہیں۔ دنیاوی واقعات بھلائے جا سکتے ہیں تاریخ کے صفحات گم ہو سکتے ہیں۔ بڑی بڑی چٹانوں پر گاڑی ہوئی لاٹھیں، اور ان لاٹھوں پر کندہ کی ہوئی داستانیں زمانے کے ہاتھوں تباہ ہو سکتی ہیں۔ لیکن خدا کے آخری رسول کا وہ ازلی پیغام، جو قرآن کے دفتین میں محفوظ کر دیا گیا ہے کبھی مٹ نہیں سکتا کہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود اس نے لی ہے۔ جو زندہ ہے، کبھی مر نہیں سکتا، جو قائم ہے کبھی فنا نہیں ہو سکتا۔ وہ باقی ہے وہ زندہ ہے اس کا کلام بھی زندہ ہے۔ یہ جشنِ عید اسی خدائے حی قیوم کے زندہ قرآن کے نزول کی یادگار میں ہے اور جب تک دنیا باقی ہے۔ یہ یادگار بھی باقی رہے گی۔ اللہ اکبر۔ اللہُ اکبر۔ لَا اِلٰہَ الا اللہ واللہ اکبر۔ اللہُ اکبر و للہِ الحمد۔

پھر جیسے یہ کتاب دنیا کی تمام کتابوں سے انوکھی[۱] اور عجیب تر ہے۔ اسی طرح اس کی یادگار بھی دنیا کی تمام یادگاروں سے نرالی ہے۔ دنیا کے جشن انسانوں کی یادگاریں، کھیل تماشے راگ رنگ عیش و نشاط سے منائی جاتی ہیں۔ لیکن شعائر الٰہی کی یادگاریں منانے کے لیے ایک بالکل الگ گرم طریقہ تجویز کیا گیا ہے۔ اس کے لیے مہینہ بھر سے لوگ تیار کیے جا رہے تھے انھیں سکھایا جا رہا تھا کہ اپنے نفس شریر سے تکبر، نخوت، غرور، طغیان، عصیان کے بھوت نکال کر اس میں عجز و انکسار، فراخ حوصلگی اور فراخدلی کے جذبات پیدا کرو۔ جھوٹ، فریب، دغابازی غداری کو چھوڑ کر راست روی اور راست گوئی کی زندگی اختیار کرو۔ دنیا کی تمام جھوٹی طاقتوں سے منہ موڑ کر اس ایک خدا کے غلام بن جاؤ۔ مانگو تو اس سے مانگو جھکو تو اس کے سامنے جھکو۔ بھوکے اور پیاسے رہ کر اپنے فرائض انجام دو۔ یہ ایک ٹریننگ تھی جو سپاہی کو میدان میں لانے سے پیشتر دی جاتی ہے۔ پورے ایک مہینے کی محنت و

[۱] انوکھی اس معنی میں کہ اس سے پہلے کی آسمانی کتابیں اپنی اصل شکل میں باقی نہیں رہیں۔

ریاضت سے قلوب میں تقویٰ پیدا کر دیا تو انھیں اب ایک جگہ جمع ہونے کا حکم دیا گیا کہ نیک دل اور پاکیزہ دماغ لے کر سر جوڑ کر بیٹھیں۔ اور سوچیں کہ ہمیں اس امتیازی زندگی کے حاصل کرنے کے لیے کیا کچھ کرنا ہے جو متقیوں کی مومنین کی، مسلمانوں کی خصوصیت ہے اور جس کا وعدہ قرآن کریم میں موجود ہے۔

سلیم! اسلام رہبانیت کا مذہب نہیں۔ دنیا تیاگ دنیا، زیب وزینت سے نفرت کرنا، ہنسی خوشی سے بیزار ہو جانا، یہ اسلام نہیں سکھاتا۔ وہ دنیا میں عزت و وقار، مسرت و شادکامی، سرداری وسربلندی کی زندگی بسر کرنا سکھاتا ہے۔ اس لیے اس جشن میں عمدہ کپڑے پہننے سے، اچھے کھانے کھانے سے۔ دوستوں کو تحائف دینے سے، بچوں کے لیے خوشی اور مسرت کے سامان بہم پہونچانے سے اس نے نہیں روکا۔ لیکن جس طرح وہ دنیا کی ہر کامیابی کے وقت خدا کی یاد سامنے لے آتا ہے اسی طرح وہ ہر آسائش و مسرت کے موقع پر خدا کے محتاج و مفلس بندوں کو بھی نہیں بھلاتا۔ (اس وقت سلیم! میں اس مسئلہ کو نہیں چھیڑنا چاہتا کہ ان کے افلاس میں خود ہماری سوسائٹی۔ ہماری اجتماعی تشکیل کی کس قدر ذمہ داری ہوتی ہے۔ یہ کبھی پھر سہی) اس نے یہ حکم دیا ہے کہ جب تم اپنے بچوں کے لیے خوشی اور مسرّت کے سامان بہم پہونچانے لگو۔ تو سب سے پہلے یہ بھی دیکھو کہ غریب اور نادار لوگوں کی مسرت کا کیا انتظام ہے۔ پہلے ان کی خوشی کا سامان کرو۔ پھر جشن میں آؤ۔ کہ جب تک تمہاری قوم کے ادنیٰ و اعلیٰ افراد اس جشن میں شریک نہیں ہوں گے، جشن مکمل نہ ہوگا تمہاری خوشی اسی میں ہے کہ ساری قوم خوش ہو۔ تمہاری بڑائی اسی میں ہے کہ ساری قوم بڑی ہو۔

سلیم! تمہیں معلوم ہے کہ قوم کی حالت کیا ہے؟ اس کا اندازہ اس سے مت لگاؤ کہ تمہارے سامنے نئے نئے کپڑے پہننے والے مسلمان بیٹھے ہیں۔ قوم کی حالت کا اندازہ لگانا ہو تو جاؤ ان گھروں کے اندر جہاں سے یہ نئے نئے کپڑوں والے نکلے ہیں اور دیکھو کہ کتنے گھر ہیں جن کے

مٹکے اور مٹھلیاں اوندھی پڑی ہیں کہ کئی دنوں سے ان میں آٹا نہیں پڑا۔ دیکھو کہ کتنے چولہے ہیں جن میں مکڑی نے جالا تن رکھا ہے کہ کئی وقت سے ان میں آگ نہیں جلی۔ دیکھو کہ کتنی شریف عورتیں ضرورت کے لیے گھروں سے باہر نہیں آسکتیں کہ ان کے سروں پر چادر نہیں ہے دیکھو کہ کتنے بچے اور بوڑھے رات بھر الاؤ کے گرد بیٹھے رہتے ہیں کہ اس سردی میں ان کے پاس اوڑھنے کو لحاف نہیں۔ دیکھو کہ کتنے جوان مریض موت کے منہ میں کھنچے چلے جارہے ہیں کہ ان کی دوا کے لیے گھر میں پیسہ نہیں۔ نہیں اس سے بھی آگے بڑھو۔ اور دیکھو کہ کتنے کسان ہیں کہ جن کے بچے بھوکوں مر رہے ہیں کہ ان کی فصلوں کو بارش نے تباہ کر دیا تھا۔ کتنے گھروں کے کمانے والے حوالات میں بند ہیں کہ فصلوں کی تباہی کی وجہ سے وہ مہاجنوں کا قرضہ نہیں اتار سکتے تھے۔ سردی، بھوک، محتاجی۔ بربادی کے ان ہولناک مناظر کو دیکھو اور پھر اندازہ لگاؤ کہ قوم کی کیا حالت ہے اور اگر تمہارے سینہ میں دل۔ اور دل میں احساس کی کوئی رمق باقی ہے تو اس سے سوچو کہ آج تمہارا یہ جشن مسرت کا جشن ہے۔ یا بربادی کا ماتم ـــ اسلام یقیناً دنیا تیاگ دینے کا مذہب نہیں۔ لیکن میں پھر ایک دفعہ دہراتا ہوں کہ اس کے نزدیک وہ خوشی جو چند افراد کی خوشی ہو اور باقی قوم کا اس میں کوئی حصہ نہ ہو، خوشی نہیں، ماتم ہے۔ جشن نہیں سوگ ہے سلیم! میں جانتا ہوں کہ خوشی کے موقع پر مصیبتوں اور تکلیفوں کی یاد بدشگونی خیال کی جاتی ہے لیکن آج ہم جس دور سے گذر رہے ہیں، اس میں خوشی کو خوشی سمجھنا، خود اپنے آپ کو فریب دینا ہے۔ دھوکا دینا ہے۔ بلّی کو آتا دیکھ کر کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لینا ہے۔

سلیم تم کہدو کہ نہیں! قوم کی حالت کا صحیح اندازہ ان مقامات سے نہ لگاؤ جو میں نے کہے ہیں بلکہ ان سینما ہالوں سے لگاؤ جو چار چار وقت تماشے دکھا رہے تھے۔ ایک دہلی ہی میں قریب سولہ تھیٹر ہیں۔ اگر ایک ایک تھیٹر ہال کی آمدنی پانچ سو روپئے بھی لگائی جائے (جو عید کے دن کے لحاظ سے بہت

بہت کم ہے) تو بھی ایک دن میں ایک شہر سے کم از کم تیس ہزار روپیہ صرف سینما کے نذر ہو گیا۔ اور حال میں بالخصوص عید کے دن سوائے مسلمانوں کے اور کوئی نظر نہیں آئے گا۔ تم کہہ سکتے ہو کہ جس قوم کی یہ حالت ہو اسے غریب و مفلس کون کہہ سکتا ہے، تم سچ کہتے ہو لیکن بھائی! اس جہالت کے ذمہ دار عوام نہیں کہ ان کو تو ایک وقت کے کھانے کے بعد دوسرے وقت کی ذمہ داری کا احساس نہیں ہوتا۔ اس کی زیادہ ذمہ دار وہ مقدس ہستیاں ہیں جو اخلاق و اقتصادیات کے ایسے حسین مزاروں پر اپنے ہاتھ سے عقیدت کے پھول چڑھا کر عوام کو ان کی زیارت کی دعوت دیتے ہیں۔ اور جب ان سے اس کے متعلق بادب کچھ گزارش کیا جائے تو اپنی لاہوتی زبان میں ایسی توجیہات بیان فرماتے ہیں کہ سرحد اور اک سے ادھر کا انسان منہ دیکھتا رہ جائے کہ یا اللہ یہ کس دیس کی بولی ہے؟ تم نے خود ہی تو مجھ سے کہا تھا کہ عین عید کے دن چاندنی چوک کے ایک مشہور تھیٹر (ڈیلائٹ پیلیس) میں ممتاز ملکہ کی فلم کا افتتاح حضرت خواجہ حسن نظامی مدظلہ کے مبارک ہاتھوں ہوا تھا۔

اب سلیم! تمہاری آخری بات کا جواب رہ گیا۔ کہ جب ہماری عبادات میں آج وہ روح اور مقصد نہیں رہا تو میں پھر ان کی پابندی اور ان کو قائم رکھنے کی کیوں اس قدر شدت سے تاکید کرتا رہتا ہوں۔ عزیزم! یہ اس لیے کہ جیسا کہ میں کئی بار لکھ چکا ہوں، ہماری نجات و سعادت انہی مناسک و عبادات کی راہوں سے آئے گی۔ اور اس سعادت کے بعد ہماری شوکت و عظمت کے قیام کے ضامن بھی یہی عبادات و مناسک ہی ہوں گے کہ یہ قرآن کریم کا فیصلہ ہے۔ سو اگر آج ہماری قرآن سے دوری کے باعث ان میں روح نہیں رہی، تو ان کی صورت باقی ضرور رکھی جائے کہ جب اللہ اپنی رحمت سے ہم سے پردہ اٹھائے گا تو اسی پتلے کے اندر روح آ جائے گی۔ اور یہ پھر چلتا، پھرتا، جیتا، جاگتا، انسان بن جائے گا۔ اگر روح خود مٹی تھی اور صورت کو ہم مٹا دیں، تو پھر ہماری نئی زندگی کی کوئی امید باقی نہیں رہے گی۔

اور یوں بھی ان لوگوں کا خاتمہ تو نہیں ہوگیا۔ جن کی عبادات میں روح باقی ہے اور وہی روح وہ دوسروں میں بھی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عید کی نماز کے بعد میں نے تمہیں خاموشی سے بیٹھے رہنے کی تاکید کی تھی اگرچہ خطیب کا ایک لفظ بھی تمہارے کانوں تک نہیں آسکتا تھا، اور اگر آتا بھی تو اس سے تمہیں فائدہ کچھ نہ تھا کہ وہ عربی میں تھا اور تم عربی جانتے نہ تھے۔ اور اگر جانتے بھی ہوتے تو بھی اس میں مصالح وقت کی کوئی بات نہ تھی۔ باقی رہا یہ کہ لوگوں نے اس قدر بھاگم دوڑ کیوں شروع کر رکھی تھی سو اس کا جواب مجھ سے نہیں اُن مولوی صاحبان سے پوچھئے کہ جو اپنی ذاتی آواز کو دور تک پہنچانے کے لیے ٹیلیفون کا استعمال بالکل جائز سمجھتے ہیں۔ لیکن اپنے خطبہ کی آواز دور تک پہنچانے کے لئے آلۂ مکبر الصوت کا استعمال ناجائز قرار دیتے ہیں! والسلام۔

مسئلہ تحلیل ربوا پر ایک قانونی نظر

(بسلسلۂ اشاعت رمضان ۵۵ھ)

تعلقات خارجیہ کا قانون اسلامی قانون کا یہ شعبہ ان لوگوں کے جان و مال کی قانونی حیثیات بحث کرتا ہے جو اسلامی حکومت کے حدود سے باہر رہتے ہوں۔ اس کی تفصیلات بیان کرنے سے پہلے چند امور کی توضیح ضروری ہے۔

فقہی اصطلاح میں لفظ دار قریب قریب انہی معنوں میں استعمال کیا گیا ہے جن میں انگریزی لفظ (Territory) بولا جاتا ہے۔ جن حدود ارضی میں مسلمانوں کو حقوق شاہی حاصل ہوں وہ دار الاسلام ہیں، اور جو علاقہ ان حدود سے خارج ہو وہ دار الکفر یا دار الحرب ہے۔ تعلقات خارجیہ کا قانون تمام تر انہی مسائل سے بحث کرتا ہے جو اس ارضی تفریق یا تباین دارین سے نفوس اور اموال کے بارے میں پیدا ہوتے ہیں۔

جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں اعتقادی حیثیت سے تو تمام مسلمان اسلامی قومیت کے افراد (Nationals) ہیں، لیکن اس شعبۂ قانون کی اغراض کے لیے ان کو تین اقسام پر منقسم کیا گیا ہے ایک وہ جو دار الاسلام کی رعایا (Citizens) ہوں۔ دوسرے وہ جو دار الکفر یا دار الحرب کی رعایا ہوں۔ تیسرے وہ جو رعایا تو دار الاسلام ہی کی ہوں، مگر مستامن کی حیثیت سے عارضی طور پر دار الکفر یا دار الحرب میں جائیں اور مقیم ہوں۔ ان سب کے حقوق اور واجبات الگ الگ متعین کیے گئے ہیں۔

اس کے مقابلہ میں کفار اگرچہ سب کے سب اعتقاداً اسلامی قومیت سے خارج ہیں، مگر قانوناً

ان کو بھی ان کے حالات کے لحاظ سے متعدد اقسام پر منقسم کیا گیا ہے۔ ایک وہ جو پیدائشی ذمّی (Natural bcrn subjects) ہوں یا وضع جزیہ و خراج کے ذریعہ سے جن کو ذمی بنا لیا گیا ہو (Naturalised subjects)۔ دوسرے وہ جو دارالاسلام کی رعایا نہ ہوں، بلکہ مستامن کی حیثیت سے دارالاسلام میں آئیں اور رہیں (Domiciled aliens)۔ تیسرے وہ جو دارالکفر یا دارالحرب کی رعایا ہوں اور امان کے بغیر دارالاسلام میں داخل ہو جائیں۔ چوتھے وہ جو اپنے ہی دار میں ہوں۔

پھر اس آخری قسم کے کفار کی بھی متعدد اقسام ہیں۔ ایک وہ جن سے اسلامی حکومت کا معاہدہ ہو۔ دوسرے وہ جو اسلامی حکومت کو خراج دیتے ہوں مگر ان کے حدود میں احکام اسلامی جاری نہ ہوں۔ تیسرے وہ جن سے کوئی معاہدہ نہ ہو مگر دشمنی بھی نہ ہو۔ چوتھے وہ جن سے مسلمانوں کی دشمنی ہو۔

اس طرح حدود ارضی یعنی دار (Territory) کے لحاظ سے اشخاص اور املاک کی حیثیات میں جو فرق واقع ہوتا ہے اور اس فرق کے لحاظ سے ان کے درمیان احکام میں جو تمیز کی جاتی ہے اس کو مدنظر رکھنا قانون اسلامی کی صحیح تعبیر کے لیے نہایت ضروری ہے۔ جب کبھی ان فرق اور امتیازات کا لحاظ کیے بغیر محض قانونی عبارات کے الفاظ کی پیروی کی جائے گی تو صرف ایک سود کے مسئلہ ہی میں نہیں بلکہ بکثرت فقہی مسائل میں ایسی غلطیاں پیش آئیں گی جن سے قانون مسخ ہو جائے گا اور اپنے مقاصد کے خلاف استعمال کیا جانے لگے گا۔

ان ضروری توضیحات کے بعد ہم ان سوالات کی طرف رجوع کرتے ہیں کہ دارالحرب کا اطلاق در اصل کن علاقوں پر ہوتا ہے۔ کن مراتب کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور ہر مرتبہ کے احکام کیا ہیں؟ حربیت کے کتنے مدارج ہیں اور ہر درجہ کے لحاظ سے اباحت نفوس و اموال کی نوعیت کس طرح بدلتی ہے؟ پھر اختلاف دارین کے لحاظ سے خود مسلمانوں کی حیثیات میں کیا فرق واقع ہوتا ہے اور ہر حیثیت کے لحاظ سے ان کے

حقوق و واجبات کس طرح بدلتے ہیں؟

دارالکفر کے اقسام کفار کی جو اقسام ہم نے اوپر بیان کی ہیں ان میں سے اہل ذمہ کے متعلق تو ہر شخص جانتا ہے کہ بجز خمر و خنزیر اور نکاح محارم اور عبادت غیر اللہ کے اور تمام معاملات میں ان کی حیثیت وہی ہے جو مسلمانوں کی ہے۔ اسلام کے تمام ملکی قوانین ان پر جاری ہوتے ہیں، وہ ان سب چیزوں سے روکے جاتے ہیں جن سے مسلمان روکے جاتے ہیں، اور ان کو عصمت جان و مال و آبرو کے وہ تمام حقوق حاصل ہوتے ہیں جو دارالاسلام کے مسلمانوں کو حاصل ہوتے ہیں۔ ان کو الگ کرنے کے بعد اب ہمیں صرف ان کفار کے حالات پر نظر ڈالنی چاہیے جو دارالکفر میں مقیم ہوں۔

باج گزار (۱) وہ کفار جو اسلامی حکومت کو خراج دیتے ہوں اور جن کو اپنے ملک میں احکام کفر جاری کرنے کی آزادی حاصل ہو۔ ان کا ملک اگرچہ دارالکفر ہے مگر دارالحرب نہیں، اس لیے کہ جب مسلمانوں نے ادائے خراج پر انھیں امان دے دی تو حربیت مرتفع ہوگئی۔ قرآن میں آیا ہے کہ فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا (النساء: ۱۲) یعنی اگر وہ جنگ سے باز آجائیں اور صلح پیش کریں تو اللہ نے تمہارے لیے ان پر دست درازی کی کوئی سبیل نہیں رکھی اسی بنا پر فقہاء نے تصریح کی ہے کہ ان کے اموال اور نفوس اور اعراض سے تعرض نہیں کیا جا سکتا۔

وان وقع الصلح علیٰ ان یودوا الیھم	اور اگر ان سے اس بات پر صلح ہوئی ہو کہ وہ ہر سال
کل سنۃ مأۃ رأس فان کانت ھذہٖ	سو غلام دیں گے تو یہ سو غلام اگر خود انہی کی جماعت
المأۃ الرأس یودونھا من انفسھم	میں سے ہوں یا ان کی اولاد ہوں تو ان کا لینا درست
واولادھم لم یصلح ھذا الان الصلح	نہ ہوگا کیونکہ صلح کا اطلاق ان کی پوری جماعت پر ہوگا
وقع علیٰ جماعتھم فکانوا جمیعًا مستامنین	اور وہ سب مستامن ہوں گے اور مستامن کو غلام
واسترقاق المستامن لا یجوز (المبسوط	بنانا جائز نہیں۔
للامام السرخسی ج ۱۰۔ ص ۸۸	

ولو دخل رجل منهم دار حرب اخرى فظهر المسلمون عليهم لم يتعرضوا له لانه في امان المسلمين (الفقاص ۹)

اگر ان میں سے کوئی شخص کسی دوسرے دار الحرب میں مقیم ہو اور اسلامی فوجیں اس ملک میں داخل ہوں تو اس شخص سے کوئی تعرض نہ کیا جائیگا کیونکہ وہ مسلمانوں کی امان میں ہے۔

وان كان الذين سبوهم قوم من المسلمين غدروا باهل الموادعة لم يسع للمسلمين ان يشتروا من ذالك السبي وان اشتروا رددت البيع لانهم كانوا في امان المسلمين (الفقاص ۹۷)

اگر مسلمانوں کی کوئی جماعت ان کے ساتھ غدر کر کے ان کے آدمیوں کو غلام بنالے تو مسلمانوں کے لیے ان غلاموں کا خریدنا جائز نہ ہوگا اور اگر انہوں نے خرید لیا ہو تو اس بیع کو رد کر دیا جائے گا کیونکہ وہ مسلمانوں کی امان میں تھے۔

اس قسم کے کفار اگرچہ نظری حیثیت سے اہل حرب متصور رہتے ہیں (لانهم بهذه الموادعة لا يلتزمون احكام الاسلام ولا يخرجون من ان يكونوا اهل حرب - مبسوط ج ۱۰ ص ۸۸) لیکن ان کے اموال مباح نہیں اور ان کے ساتھ عقود فاسدہ پر کوئی معاملہ نہیں کیا جا سکتا، خواہ وہ سود خوار ہی کیوں نہ ہوں۔ بلکہ اگر وہ اپنے دار میں بھی نہ ہوں بلکہ ایسے دار میں ہوں جہاں بالفعل جنگ ہو رہی ہو تب بھی مسلمانوں کے لیے ان سے عقود فاسدہ پر معاملہ کرنا جائز نہ ہوگا۔

معاہدین (۲) وہ کفار جن سے دار الاسلام کا معاہدہ ہو۔ ان کے متعلق قرآن کی تصریحات حسب ذیل ہیں:

اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ۔ (التوبہ ۱)

بجز ان مشرکین کے جن سے تم نے معاہدہ کیا ہے پھر انہوں نے تمہارے ساتھ وفائے عہد میں کمی بھی نہ کی اور نہ تمہارے خلاف کسی کو مدد دی۔ ان کے ساتھ تم معاہدہ کی مدت مقررہ تک عہد پورا کرو۔

فَمَا اسْتَقَامُوا لَكُمْ فَاسْتَقِيمُوا لَهُمْ (التوبہ: ۲)	جب تک وہ عہد پر قائم رہیں تم بھی قائم رہو۔
وَإِنِ اسْتَنْصَرُوكُمْ فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمُ	اور جو مسلمان دارالکفر میں رہتے ہوں وہ اگر دین کے
النَّصْرُ إِلَّا عَلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ	حق کی بناء پر تم سے مدد مانگیں تو ان کی مدد کرو مگر
مِيثَاقٌ (الانفال: ۱۰)	کسی ایسی قوم کے خلاف نہیں جس سے تمہارا معاہدہ ہو
وَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِيثَاقٌ	اور اگر مقتول کسی ایسی قوم سے ہو جس کے اور تمہارے
فَدِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ (النساء: ۱۴)	درمیان معاہدہ ہو تو اس کے ورثہ کو دیت دی جائے گی

ان آیات سے معلوم ہوا کہ ایسے کفار اگرچہ نظری حیثیت سے حربی ہیں اور ان کے ملک پر دارالحرب کا اطلاق ہو سکتا ہے مگر جب تک اسلامی حکومت کا ان سے معاہدہ ہے اس وقت تک وہ مباح الدم والاموال نہیں ہیں، اور ان کی جان و مال سے تعرض کرنا غدر ہے۔ اگر کوئی مسلمان ان کا خون بہائے گا تو دیت لازم آئے گی، اور اگر ان کے مال سے تعرض کرے گا تو ضمان دینا ہوگا۔ پس جب ان کے اموال مباح ہی نہیں ہیں تو ان کے ساتھ عقود فاسدہ پر معاملہ کیسے کیا جا سکتا ہے، کیونکہ اس کا جواز تو اباحت ہی کی اصل پر مبنی ہے۔

اہل غدر (۳) وہ کفار جو معاہدہ کو توڑ دیں۔ ان کے متعلق قرآن کا حکم یہ ہے کہ

وَإِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ	اور اگر تمہیں کسی قوم سے بدعہدی کا اندیشہ ہو تو برابری
إِلَيْهِمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ (الانفال: ۷)	کو ملحوظ رکھ کر ان کا معاہدہ ان کی طرف پھینک دو۔

شمس الائمہ سرخسی اس صورت مسئلہ کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

وَلَكِن يَنبَغِي أَن يَنبِذَ إِلَيْهِمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ	(ایسی صورت میں معاہدہ کو توڑ دینا جائز ہے) مگر لازم
أَي عَلَىٰ سَوَاءٍ مِنكُمْ وَمِنْهُمْ فِي الْعِلْمِ	ہے کہ نقض معاہدہ برابری کے ساتھ ہو، یعنی تمہاری
بِذَٰلِكَ فَعَرَفْنَا أَنَّهُ لَا يَحِلُّ قِتَالُهُمْ	طرح ان کو بھی معلوم ہو جائے کہ تم نے معاہدہ کو کالعدم

قبل النبذ وقبل ان یعلموا بذلك (المبسوط ج ۱۰ ص ۸۶)

قرار دے دیا ہے۔ اس حکم سے ہم سمجھے ہیں کہ اعلان و اطلاع سے پہلے ان کے ساتھ جنگ حلال نہیں ہے۔

یہ آیت اور اس کی مذکورۂ بالا قانونی تعبیر یہ ظاہر کر رہی ہے کہ معاہد قوم اگر بد عہدی بھی کرے تب بھی اعلان جنگ سے پہلے اس کے نفوس واموال مباح نہیں ہیں۔

غیر معاہدین (۴) وہ کفار جن سے معاہدہ نہ ہو۔ یہ ایک ایسی حالت ہے جس کو ہمیشہ بین الاقوامی تعلقات میں جنگ کا پیش خیمہ سمجھا جاتا ہے۔ سیاسی تعلقات کا انقطاع (Rupture of Di plomatic relations) دراصل یہ معنی رکھتا ہے کہ دونوں قومیں اب باہمی احترام کی قیود سے آزاد ہیں۔ ایسی حالت میں اگر ایک قوم دوسری قوم کے آدمیوں کو قتل کردے یا لوٹ لے تو کوئی دیت یا ضمان واجب نہ ہوگا۔ اس معنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ دونوں قوموں کے لیے ایک دوسرے کے نفوس واموال مباح ہیں۔ مگر کوئی مہذب حکومت باقاعدہ اعلان جنگ کیے بغیر کسی انسانی جماعت کا خون بہانا یا مال لوٹنا پسند نہیں کر سکتی۔ اسلامی قانون اس باب میں یہ ہے:۔

وَلو قاتلوھم بغیر دعوة کانوا اٰثمین فی ذالكَ ولکنھم لایضمنون شیئًا مما اتلفوا من الدماء والاموال عندنا (المبسوط ج ۱۰ ص ۳۰)

اور اگر مسلمانوں نے دعوت کے بغیر ان سے جنگ کی تو وہ گناہ گار ہوں گے، لیکن جو کچھ جان ومال وہ تلف کریں گے اس میں سے کسی چیز کا ضمان حنفیہ کے نزدیک مسلمانوں پر لازم نہ آئے گا۔

امام شافعی فرماتے ہیں کہ ضمان لازم آئے گا کیونکہ جب تک وہ دعوت کو رد نہ کردیں ان کے جان ومال کی حرمت وعصمت باقی ہے۔ حنفیہ کہتے ہیں کہ:۔

ولکنا نقول العصمة المقومة تکون بالاحراز وذالك لم یوجد فی حقھم.. ولکن

جس عصمت کی بنا پر جان ومال کی قیمت قائم ہوتی ہے وہ تو حفاظت دارین ہونے پر موقوف ہے اور یہ

شرط الاباحة تقديم الدعوة فيد ونه لايثبت ومجرد حرمة القتل لايكفى لوجوب الضمان (ايضاً ص۳۰-۳۱)	یہ ضرور ہے کہ اباحت ..... چیز ان کے حق میں موجود نہیں۔ کے لیے تقدیم دعوت شرط ہے، اور اس کے بغیر اباحت ثابت نہیں ہوتی لیکن محض حرمت قتل، وجوب ضمان کے لیے کافی نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ حربی کفار جو ذمی نہیں ہیں جن سے کوئی معاہدہ نہیں ہے، جن کا دار ہمارے دار سے مختلف ہے، جن کی عصمت ہمارا قانون تسلیم نہیں کرتا ان کے نفوس و اموال بھی ہم پر اس وقت تک حرام ہیں جب تک کہ اتمام حجت نہ ہو اور ہمارے اور ان کے درمیان باقاعدہ اعلان جنگ نہ ہو جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس باب میں حضرت معاذ بن جبل کو جو ہدایات دی تھیں وہ قابل غور ہیں:۔

لاتقتلوهم حتى تدعوهم فان ابوا فلا تقتلوهم حتى يبدؤكم فان بدؤكم فلا تقاتلوهم حتى يقتلوا منكم قتيلا ثم ارو هم ذالك القتيل و قولوا لهم هل الى خير من هذا سبيل فلان يهدى الله تعالى على يديك خير لك بما طلعت عليه الشمس و غربت۔	ان سے جنگ نہ کرنا جب تک کہ ان کو دعوت نہ دے لو۔ پھر اگر وہ انکار کریں تب بھی جنگ نہ کرنا جب تک وہ ابتدا نہ کریں۔ پھر اگر وہ ابتدا کریں۔ تب بھی جنگ نہ کرنا جب تک کہ وہ تم میں سے کسی کو قتل نہ کر دیں۔ پھر اس مقتول کو دکھا کر ان سے کہنا کہ کیا اس سے زیادہ بہتر کسی بات کے لیے تم آمادہ نہیں ہو سکتے؟ اے معاذ اس قدر صبر و تحمل کی تعلیم اس لیے ہے کہ اگر اللہ تیرے ہاتھ پر لوگوں کو ہدایت بخش دے تو یہ اس سے زیادہ بہتر ہے کہ تیرے قبضہ میں مشرق سے مغرب تک سارا ملک و مال آ جائے۔

محاربین (۵) اب صرف وہ کفار باقی رہ جاتے ہیں جن سے مسلمانوں کی بالفعل جنگ ہو۔ اصلی حربی یہی ہیں، انہی کے دار کو تعلقات خارجیہ کے قانون میں دارالحرب (Enemy country)

کہا جاتا ہے، انہی کے نفوس اور اموال مباح ہیں اور انہی کو قتل کرنا، گرفتار کرنا، لوٹنا اور مارنا شریعت نے جائز قرار دیا ہے۔ لیکن حربیت (Enemy character) تمام محاربین میں یکساں نہیں ہے اور نہ تمام اموال حربیہ ایک ہی حکم میں ہیں۔ حربی کافروں کی عورتیں، ان کے بچے، ضعفاء اور معذورین وغیرہ بھی اگرچہ حربی ہیں، مگر شریعت نے ان کو مباح الدم نہیں ٹھیرایا ہے بلکہ اباحت قتل کو صرف مقاتلین تک محدود رکھا ہے۔ (انما یقتل من یقاتل۔ قال اللہ تعالیٰ وقاتلوھم والمفاعلة تکون من الجانبین۔ المبسوط۔ ج ۱۰ صـ۶۴)۔ اسی طرح اموال حربیہ میں بھی شریعت نے فرق مدارج کیا ہے اور ہر درجہ کے احکام الگ ہیں۔

اموال حربیہ کے مدارج اور احکام اگرچہ اصولی حیثیت سے تمام وہ اموال واملاک جو دشمن کے علاقہ میں ہوں، مباح (Confiscable) ہیں، لیکن شریعت اسلامی نے ان کو دو اقسام پر منقسم کیا ہے۔

غنیمت ایک قسم اُن اموال منقولہ کی ہے جن پر رقبۂ جنگ میں اسلامی فوج اپنے اسلحہ کی طاقت سے قابض ہو۔ یہ اموال غنیمت ہیں جن کا ⅕ حصہ حکومت کا حق ہے اور ⅘ ان لوگوں کا جنہوں نے ان کو لوٹا ہو۔ امام ابویوسف رحمۃ اللہ کتاب الخراج میں غنیمت کی تعریف اس طرح کرتے ہیں۔

فھذا فیما یصیب المسلمون من عساکر اھل الشرک وما اجلبوا بہ من المتاع والسلاح والکراع (صـ۱۰)

خمس ان اموال میں ہے۔ جو مسلمانوں کو اہل شرک کے لشکروں سے ہاتھ لگیں اور جو ساز و سامان اور اسلحہ اور جانوروں کی قسم سے ہوں۔

دوسری جگہ پھر فرماتے ہیں: فما اصاب المسلمون من عساکر اھل الشرک وما اجلبوا بہ من المتاع والکراع والسلاح وغیر ذلک۔ اس سے ظاہر ہوا کہ غنیمت کا اطلاق صرف ان اموال منقولہ پر ہوتا ہے جو جنگی کارروائی (Warlike operations) کے دوران میں

غنیم کے لشکروں سے ہاتھ آئیں۔ لشکروں کے حدود سے باہر عام آبادیوں کو لوٹتے مارتے پھرنا شریعت کی نگاہ میں درست نہیں۔ اگرچہ دار الحرب کے تمام اموال مباح ہیں، اور اگر کوئی شخص غیر مقاتلین کے اموال سے تعرض کرے تو اس پر نہ کوئی ضمان لازم ہوگا، نہ لوٹے ہوئے اموال واپس کئے جائیں گے لیکن اس قسم کی لوٹ مار پسندیدہ نہیں ہے۔ امام مسلمین ہر ممکن طریقہ سے اپنی فوجوں کو ایسی حرکات سے روکے گا کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ من غزا فخراً و رياءً و سمعة وعصى الامام وافسد فی الارض فانه لم يرجع بالكفاف (ابوداود۔ باب فی من یغزو ویلتمس الدنیا)۔

فَے | دوسری قسم ان اموال منقولہ وغیر منقولہ کی ہے جو غنیم کے لشکر سے لڑکر حاصل نہ کئے گئے ہوں بلکہ نتیجۂ فتح کے طور پر حکومت کے تحت تصرف آئیں، عام اس سے کہ وہ غنیم کی رعایا کے املاک ہوں یا دشمن سلطنت کے ہوں۔ اسلامی اصطلاح میں ایسے اموال کو فَے کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اور یہ غنیمت سے بالکل مختلف چیز ہے (وغنيمة العسكر مخالفة لما افاء الله من اهل القرى والحكم فی هذا غير الحكم فی تلك الغنائم۔ کتاب الخراج ص ۳۶) اس کے متعلق سورۂ حشر میں تشریح کردی گئی ہے کہ یہ کسی شخص کی ملکیت میں نہ دی جائیگی بلکہ اس کا تعلق بیت المال سے ہوگا اور اُسے مصالح عامہ میں خرچ کیا جائیگا وَمَا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ مِنْهُمْ فَمَا أَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَلَا رِكَابٍ، الی آخر الآیۃ۔ لفظ فَے کا کوئی اور مفہوم اس کے سوا نہیں ہے اور کتب فقہیہ میں ہم کو کہیں بھی کسی ایسی فَے کا نشان نہیں ملا جس کو ہر شخص بطور خود حاصل کرے اور اپنی ہی جیب میں رکھ لے۔ جگہ جگہ فئ للمسلمين، فئ يوضع فی بيت مال المسلمين، فئ لجماعة المسلمين اور ایسے ہی دوسرے الفاظ ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ متقدمین صرف اس فَے سے واقف تھے جو جماعت کی ملک ہوتی ہے اور حکومت اسلامی کے زیر تصرف ہوا کرتی ہے۔

غنیمت اور لوٹ میں امتیاز | پھر غنائم حاصل کرنے کا شرعی حق صرف انہی لوگوں کو دیا گیا ہے جو اسلامی

سلطنت کے زیر حفاظت ہوں اور جن کو امام مسلمین کی اجازت نصاً یا حکماً حاصل ہو۔ ان کے سوا اگر عام مسلمان فرداً فرداً یا جماعت بنا کر بطور خود لوٹ مار کرنے لگیں تو ان کی حیثیت لٹیروں کی ہوگی، ان کی غنیمت "غنیمت" نہ ہوگی، لوٹ ہوگی، اس لیئے اس میں سے اللہ کا حصہ (یعنی خمس) قبول نہ کیا جائیگا البتہ وہ انہی میں تقسیم کر دیا جائے گا، کیونکہ دشمن کو واپس دلانا تو بہر حال ممکن نہیں (فان کان دخول القوم الذین لا منعة لهم بغیر اذن الامام علی سبیل التلصص فلا خمس فیما اصابوا عندنا ولکن من اصاب منهم شیئاً فهو له خاصة ۔ المبسوط ج ۱۰۔ ص ۷۲) اس کی وجہ جو کچھ علامہ سرخسی نے لکھی ہے وہ بھی ملاحظہ فرمایئے:۔

والمعنی ما بینا ان الغنیمة اسم لمال مصاب باشرف الجهات وهو ان یکون فیه اعلاء کلمة الله تعالی واعزاز الدین ولهذا جعل الخمس منه لله تعالی وهذا المعنی لا یحصل فیما یاخذه الواحد علی سبیل التلصص فیتمحض فعله اکتساباً للمال (ایضاً ص ۷۳)

بات دراصل یہ ہے جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ غنیمت اس مال کا نام ہے جو انتہا درجہ کے پاک اور اشرف طریقہ سے ہاتھ آئے اور وہ یہ ہے کہ اس میں اللہ کے کلمہ کا اعلاء اور اس کے دین کا اعزاز ہو۔ اسی لیے اس میں اللہ کا پانچواں حصہ مقرر کیا گیا۔ یہ بات اس مال میں نہیں ہوتی جس کو ایک شخص تلصص کے طور پر حاصل کرتا ہے کیونکہ اس کا مقصد تو محض اکتساب مال ہے۔

اس کی نظیر میں امام سرخسی وہ حدیث پیش کرتے ہیں جس میں ذکر ہے کہ مشرکین ایک مسلمان لڑکے کو پکڑ لے گئے تھے۔ کچھ مدت بعد وہ لڑکا ان کے قبضہ سے بھاگ نکلا اور ان کی کچھ بکریاں بھی پکڑ لایا۔ حضور نے یہ بکریاں اسی کے حوالہ کر دیں اور ان میں سے خمس لینا قبول نہ کیا۔ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ بھی اسی کی تائید میں ہے۔ وہ اپنے ساتھیوں کا مال لوٹ کر مدینہ حاضر ہوئے اور اسلام لائے۔ جب انہوں نے لوٹ کا مال حضور کی خدمت میں پیش کیا تو آپ نے فرمایا کہ تمہارا اسلام مقبول ہے مگر یہ مال مقبول نہیں۔

دار الحرب میں کفار کے حقوق ملکیت غنیمت پر تیسری قید یہ لگائی گئی ہے کہ غانمین جب تک دار الحرب میں مقیم ہیں اس وقت تک وہ اموال غنیمت سے استفادہ نہیں کر سکتے۔ اس قید سے صرف سامان خورونوش اور جانوروں کا چارہ مستثنیٰ ہے یعنی دوران جنگ میں جس قدر آذوقہ اور چارہ فوجوں کے ہاتھ لگے گا اس میں سے ہر مجاہد بقدر حاجت لے سکتا ہے۔ اس کے سوا باقی تمام اموال غنیمت سردار لشکر کے پاس جمع کر دیئے جائیں گے اور ان کو غانمین میں اس وقت تک تقسیم نہ کیا جائے گا جب تک کہ وہ دار الاسلام کی طرف منتقل نہ کر دیئے جائیں۔ اس لیے کہ حنفیہ کے نزدیک اموال غنیمت جب تک دار الحرب میں ہوں، غانمین کی ملک ان پر مکمل نہیں ہوتی۔ امام شافعی کی رائے اس کے خلاف ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ محاربین کا مال مباح ہے اس لیے جس وقت مجاہدین اسلام ان پر قابض ہوئے اسی وقت ان کے مالک بھی ہو گئے۔ مگر امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب فرماتے ہیں کہ یہ ملک ضعیف ہے گو قبضہ ہمارا ہو چکا ہے لیکن دار تو ان کا ہے۔ جب تک مال ان کے دار سے ہمارے دار میں نہ چلا جائے ہم پوری طرح اس کے مالک نہیں ہو سکتے۔ اس لیے کہ اتمام ملک کے لیے محض استیلا را Occupation کافی نہیں ہے۔ امام سرخسی اس مسئلہ میں حنفیہ کے مسلک کی توضیح اس طرح کرتے ہیں :-

فاما عندنا الحق يثبت بنفس الاخذ ويتاكد بالاحراز ويتمكن بالقسمة كحق الشفيع يثبت بالبيع ويتاكد بالطلب ويتم الملك بالاخذ وما دام الحق ضعيفاً لا تجوز القسمة ..... بالاخذ يملك الاراضي كما يملك الاموال ثم لا يتاكد الحق في الارض التي نزلوا فيها اذا لم يصيرها دار الاسلام (المبسوط، ص ۳۳)

ہمارے نزدیک نفس قبضہ سے حق صرف ثابت ہوتا ہے دار الاسلام میں لیجانے سے مضبوط ہو جاتا ہے، اور تقسیم غنیمت سے مکمل ہو جاتا ہے۔ اس کی مثال شفعہ کی سی ہے کہ شفیع کا حق بیع سے ثابت ہوتا ہے، طلب سے موکد ہوتا ہے اور قبضہ کے ساتھ مکمل ہوتا ہے۔ پس جب تک حق ضعیف رہے تقسیم جائز نہیں ہوتی ..... جس طرح اموال (جائداد منقولہ) پر نفس قبضہ سے ملک ثابت ہوتی ہے اسی طرح اراضی (جائداد غیر منقولہ) پر بھی قبضہ سے ملک ثابت تو ہو جاتی ہے مگر

جس سرزمین میں مسلمانوں کے لشکر اترے ہوں اس پر حق اس وقت تک پوری طرح قائم نہیں ہوتا جب تک کہ اس کو دارالاسلام نہ بنادیا جائے۔

اس تصریح سے معلوم ہوا کہ نہ صرف غنیمت، بلکہ فے میں بھی اسلامی حکومت اس وقت تک تصرف کا پورا حق نہیں رکھتی جب تک کہ علاقۂ مقبوضہ (Occupied territory) کو دارالاسلام نہ بنادیا جائے، یا باصطلاح جدید اپنے مقبوضات کے ساتھ اس کے الحاق (Annexation) کا باقاعدہ اعلان نہ کردیا جائے۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل بھی اسی مسلک کی تائید کرتا ہے۔ چنانچہ مکحول کا بیان ہے کہ ما قسم رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم الغنائم الا فی دارالاسلام (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی غنائم کو دارالاسلام کے سوا کہیں تقسیم نہیں فرمایا) محمد بن اسحاق اور کلبی کی روایت ہے حضور نے حُنَین کے غنائم سے واپسی پر جعرانہ میں تقسیم فرمائے تھے جو اس زمانہ میں دارالاسلام کی سرحد پر تھا۔ راستہ میں اعراب نے تقسیم کا سخت مطالبہ کیا اور حضور کو سخت پریشان کیا کہ آپ کی چادر تک پھٹ گئی مگر اس ہنگامہ کے باوجود آپ نے دارالاسلام کے حدود میں پہنچنے سے پہلے مال غنیمت کا ایک حبہ تقسیم نہ کیا۔

رسول خدا کے اس طرز عمل اور فقہاء کی ان توجیہات پر غور کیجیے۔ اس کا سبب بجز اس کے اور کچھ نہ معلوم ہوگا کہ اسلامی قانون جس طرح اسلامی مقبوضات پر اہل اسلام کے حقوق ملکیت تسلیم کرتا ہے اسی طرح غیر اسلامی مقبوضات پر اہل کفر بلکہ اہل حرب تک کے حقوق مالکانہ کو بھی تسلیم کرتا ہے اگرچہ جنگ ان کے اموال کو ہمارے لیے مباح کردیتی ہے۔ مگر شریعت نے ہم کو اس باحت سے فائدہ اٹھانے کی عام اور غیر مشروط اجازت نہیں دی بلکہ ان کی ملک سے ہماری ملک میں اموال کے منتقل ہونے کی چند ضابطہ قانونی شکلیں مقرر کی ہیں، اور یہ ایسی شکلیں ہیں جن میں ہمارے اور اہل کفر کے درمیان پوری مساوات ہے۔ حنفی قانون کہتا ہے کہ ہم ان کے اموال کے مالک اس وقت ہوں گے جب باقاعدہ جنگ میں ان پر قبضہ کرکے اپنے دار میں لے آئیں۔ اسی طرح وہ بھی جب ہمارے اموال پر جنگ کے ذریعہ سے قابض ہوکر اپنے دار میں انھیں لے جائیں گے تو ان کے مالک ہوجائیں گے، اور ان کے دار میں ان کے حقوق مالکانہ کا احترام

کرنا ہم پر لازم ہوگا۔ اس بارے میں فقہاء کی مزید تصریحات لائق غور ہیں۔

نفس الاخذ سبب لملك المال اذا تم بالاحراز وبيننا وبينهم مساواة في اسباب اصابة الدنيا بل حظهم اوفر من حظنا لان الدنيا لهم ولانه لا مقصود لهم في هذه الاخذ سوى اكتساب المال ونحن لا نقصد بالاخذ اكتساب المال (المبسوط ۱۰ ص ۵۳)

جب مال پر قبضہ کرکے اس کو دار میں پہنچا دیا گیا ہو تو اس مال پر حق ملکیت کا پورا سبب ہے اور اسباب اصابت دنیا میں ہمارے اور کفار کے درمیان کامل مساوات ہے بلکہ دنیا میں ان کا حصہ ہمارے حصہ سے کچھ زیادہ ہی ہے کیونکہ ان کے لیے تو دنیا ہی ہے اور اخذ مال سے ان کا مقصد بجز اکتساب مال کے اور کچھ نہیں بخلاف اس کے ہمارا مقصد اکتساب مال نہیں ہے۔

واذا دخل المسلم دار الحرب بامان وله في ايديهم جارية مأسورة كرهت له غصبها ووطئها لانهم ملكوها عليه والتحقت بسائر املاكهم (ایضاً ص ۵۵)

اگر کوئی مسلمان دار الحرب میں امان لے کر داخل ہو اور وہاں خود اسی کی لونڈی اس کے ہاتھ آئے جسے کفار نے قید کر رکھا ہو تو اس کے لیے اس لونڈی پر قبضہ کرنا اور اس سے وطی کرنا جائز نہیں کیوں کہ اب وہ اس کے مالک ہیں اور وہ لونڈی ان کے املاک میں داخل ہو چکی ہے۔

ولو خرج الينا بامان ومعه ذلك المال فانه لا يتعرض له فيه (ایضاً ۶۳)

اور اگر کافر حربی ہمارے دار میں امان لے کر آئے اور اس کے ساتھ خود ہم ہی سے لوٹا ہوا مال ہو تو ہم اس سے وہ مال نہیں چھین سکتے۔

فان غلب العدو على مال المسلمين فاحرزوه وهناك مسلم تاجر مستأمن حل له ان يشتريه منهم فيأكل الطعام

اگر دشمن مسلمانوں کے مال پر قابض ہو کر اسے اپنے دار میں لے جائے اور وہاں کوئی مسلمان تاجر مستامن ہو تو اس کے لیے اس مال کو خریدنا اور کھانا حلال ہے اور د

من ذلك ويطأ الجارية لانهم ملكوها بالاحراز فالتحقت بسائر املاكهم و هذا بخلاف ما لو دخل اليهم تاجر بامان فسرق منهم جارية واخرجها لم يحل للمسلم ان يشتريها منه لانه احرزها على سبيل الغدر وهو مامور بردها عليهم فيما بينه وبين ربه وان كان لا يجبره الامام على ذلك (ایضاً ص ۶۱)

ان سے خریدی ہوئی لونڈی سے وطی کر سکتا ہے کیونکہ اپنے دار میں لے جانے کے بعد وہ اس کے مالک ہو گئے اور اب وہ ان کے املاک میں شامل ہے بخلاف اس کے اگر کوئی تاجر امان لے کر جائے اور ان کے قبضہ سے لونڈی کو چرا کر دارالاسلام میں لے آئے تو مسلمان کے لیے اس لونڈی کو خریدنا حلال نہیں کیونکہ وہ غدر کر کے اسے لایا ہے اور فیما بینہ وبین اللہ وہ اسے واپس کرنے پر مامور ہے اگرچہ امام اس کو واپس کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔

یہ مسلک ٹھیک ٹھیک حدیث کے مطابق ہے۔ فتح مکہ کے روز جب حضرت علی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ اپنے مکان میں کیوں نہیں قیام فرماتے تو حضور نے جواب دیا کہ ھل ترک لنا عقیل من ربع۔ "عقیل نے ہمارے لیے چھوڑا ہی کیا ہے"۔ یہ مکان ہجرت سے قبل حضور کی ملک تھا اب باوجودیکہ فتح مکہ کے بعد مکۂ معظمہ دارالاسلام ہو چکا تھا، مگر حضور نے اس مکان کو واپس نہ لیا، کیونکہ آپ کا سابق حق ملکیت باقی نہ رہا تھا اور اہل کفر کی ملک اس پر قائم ہو چکی تھی۔

مباحث گزشتہ کا خلاصہ | یہ تمام قانونی تصریحات آپ کے سامنے ہیں ان پر غور کرنے سے حسب ذیل مسائل مستنبط ہوتے ہیں۔

۱۔ دارالحرب اگر مطلقاً دارالکفر (Foreign territory) کے معنی میں لیا جائے تو اس کے اموال مباح نہیں بلکہ صرف غیر معصوم ہیں، اور عدم عصمت کا مآل صرف اس قدر ہے کہ اسلامی حکومت اس دار میں کسی جان یا مال کے تحفظ کی ذمہ دار نہیں ہے۔ وہاں اگر کوئی مسلمان کسی مسلم یا غیر مسلم کو جان و مال کا نقصان پہنچائے گا یا اس کی ملک سے کوئی چیز حرام طریقہ سے نکال لے گا تو یہ اس کے اور خدا کے

درمیان ہے، اسلامی حکومت اس سے کوئی مواخذہ نہیں کرے گی۔

(۲) دارالحرب سے مراد اگر ایسے کفار کا دار لیا جائے جن کے نفوس و اموال مباح ہیں، تو اس معنی میں ہر دارالکفر دارالحرب نہیں ہے، بلکہ صرف وہ علاقہ دارالحرب ہے جس سے بالفعل دارالاسلام کی جنگ ہو۔ اس خاص نوع کے دارالکفر کے سوا کسی دوسرے دارالکفر کے باشندے نہ مباح الدم ہیں اور نہ مباح المال، اگرچہ وہ ذمی نہیں ہیں اور ان کے نفوس و اموال غیر معصوم ہیں۔

(۳) اس آخری معنی میں جو ملک دارالحرب ہو اس کے نفوس و اموال بھی مطلقاً ایسے مباح نہیں ہیں کہ ہر شخص وہاں لوٹ مار کرنے اور کفار کی املاک پر قبضہ کرنے کا مختار ہو۔ بلکہ اس کے لیے بھی کچھ شرائط اور قیود ہیں:

(الف) امام المسلمین باقاعدہ اعلان جنگ کرکے اس ملک کو دارالحرب قرار دے۔

(ب) وہاں جنگ کرنے والوں کو امام کا "اذن" اور اس کی "حمایت" حاصل ہو۔

(۴) غنیمت صرف اس جائداد منقولہ کو کہتے ہیں جو دشمن کے عساکر سے لڑکر حاصل کی جائے یا الفاظ دیگر اشرف جہات سے حاصل ہو اور جس میں دین کا اعزاز ہو۔ اس مال میں پانچواں حصہ اللہ کے لیے ہے۔

(۵) فے اُن اموال منقولہ و غیر منقولہ کو کہتے ہیں جو نتیجۂ فتح کے طور پر حکومت اسلامی کے قبضہ میں آئیں خراج اور مال صلح وغیرہ کا شمار بھی فے ہی میں ہے، لیکن یہ بالکلیہ اسلامی حکومت کی ملک ہے، اور کسی شخص خاص کو اس پر حقوق ملکیت حاصل نہیں ہو سکتے۔

(۶) فے اور غنیمت کے اموال پر فاتحین کو پورے حقوقِ ملکیت صرف اسی وقت حاصل ہوتے ہیں جبکہ وہ ان کو دارالحرب سے دارالاسلام میں منتقل کر دیں، یا دارالحرب کو دارالاسلام بنا دیں۔ اس سے پہلے ان اموال میں تصرف کرنا اور ان سے فائدہ اٹھانا مکروہ ہے

(۷) اسلامی قانون حربی کفار کے اموال پر اُن کے حقوقِ ملکیت کو تسلیم کرتا ہے، اور ان کی ملک سے

کوئی مال مسلمانوں کی مِلک میں جائز طور پر صرف انہی صورتوں سے منتقل ہو سکتا ہے جن کو اللہ اور رسول نے حلال کیا ہے، یعنی بیع یا صلح یا جنگ۔

مسلمانوں کی حیثیات بلحاظ اختلاف دار ان امور کے متحقق ہو جانے کے بعد اب ایک نظر یہ بھی دیکھیے کہ اسلامی قانون کے مطابق اختلاف دار کے لحاظ سے خود مسلمانوں کی حیثیات میں کیا اختلافات واقع ہوتے ہیں۔

اس باب میں تمام قوانین کی بنیاد حسب ذیل آیات و احادیث پر قائم ہے۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يُهَاجِرُوا مَا لَكُم مِّن وَلَايَتِهِم مِّن شَيْءٍ حَتَّىٰ يُهَاجِرُوا۔ (الانفال: ۱۰)	اور جو لوگ ایمان لائے مگر انہوں نے ہجرت نہ کی ان سے تمہارا دوستی اور حمایت کا کوئی تعلق نہیں تاوقتیکہ وہ ہجرت نہ کریں۔
فَلَا تَتَّخِذُوا مِنْهُمْ أَوْلِيَاءَ حَتَّىٰ يُهَاجِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ (النساء: ۱۲)۔	ان کو دوست نہ بناؤ جب تک کہ وہ اللہ کی راہ میں ہجرت نہ کریں۔
وَمَن قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ إِلَّا أَن يَصَّدَّقُوا فَإِن كَانَ مِن قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَإِن كَانَ مِن قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ وَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ (النساء ۱۳)	جو کوئی کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دے اس کو ایک مسلمان بردہ آزاد کرنا چاہیے اور اس کے وارثوں کو دیت دینی چاہیے الا یہ کہ ورثہ صدقہ کے طور پر دیت چھوڑ دیں اور اگر وہ مقتول کسی ایسی قوم سے ہو جس سے تمہاری دشمنی ہو اور ہو وہ مومن تو ایک مسلمان بردہ آزاد کرنا چاہیے اور اگر وہ ایسی قوم سے ہو جس سے تمہارا معاہدہ ہو تو اس کے وارثوں کو دیت دی جائے اور ایک مسلمان بردہ آزاد کیا جائے۔
قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم انا بریٔ من کل مسلم اقام بین اظہر المشرکین	نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں ہر اس مسلمان کی ذمہ داری سے بری ہوں جو مشرکین کے درمیان رہتا ہو۔ اور حضور نے

وعن النبی ایضاً من اقام مع المشرکین فقد برئت منه الذمة او قال لا ذمة له۔

سے یہ بھی مروی ہے کہ جس نے مشرکین کے ساتھ قیام کیا اس سے میں بری الذمہ ہوں۔ یا فرمایا اس کے لئے کوئی ذمہ نہیں۔

ابوداود کی کتاب الجہاد میں ہے کہ جب حضور کسی کو لشکر کا سردار مقرر کر کے بھیجتے تو اس کو منجملہ دوسری ہدایات کے، یہ بھی ہدایت فرماتے تھے:۔

ادعهم الی الاسلام فان اجابوك فاقبل منهم وكف عنهم ثم ادعهم الی التحول من دارهم الی دار المهاجرين واعلمهم انهم ان فعلوا ذلك ان لهم ما للمهاجرين وان عليهم ما علی المهاجرين فان ابوا واختاروا دارهم فاعلمهم انهم يكونون كاعراب المسلمين يجری عليهم حكم الله الذی كان يجری علی المومنين ولا يكون لهم فی الفئ والغنيمة نصيب الا ان يجاهدوا مع المسلمين (باب فی دعاء المشركين)

ان کو پہلے اسلام کی طرف دعوت دینا۔ اگر وہ قبول کریں تو ان سے ہاتھ روک لینا۔ پھر ان سے کہنا کہ اپنے دار کو چھوڑ کر مہاجرین کے دار یعنی دار الاسلام میں آجائیں اور انہیں بتا دینا کہ اگر انہوں نے ایسا کیا تو ان کے وہی حقوق ہوں گے جو مہاجرین کے ہیں اور وہی واجبات ان پر عائد ہوں گے جو مہاجرین پر ہیں۔ اگر وہ انکار کریں اور اپنے ہی دار میں رہنا اختیار کریں تو انہیں آگاہ کر دینا کہ ان کی حیثیت اعراب مسلمین کی سی ہوگی۔ ان پر اللہ کے وہ تمام احکام جاری ہوں گے جو مومنین پر جاری ہوتے ہیں۔ مگر فے اور غنیمت میں ان کا کوئی حصہ نہ ہوگا۔ الا یہ کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ جہاد کریں۔

ان آیات واحادیث سے فقہاء حنفیہ نے جو احکام مستنبط کئے ہیں ان کو ہم اختصار کے ساتھ یہاں بیان کرتے ہیں:۔

دارالاسلام کے مسلمان | جو نفوس واموال دارالاسلام کی حدود میں ہوں صرف انہی کی حفاظت اسلام کے

ذمہ ہے اور جو مسلمان دارالاسلام کی رعایا ہوں دینی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ دنیوی حیثیت سے بھی اسلام کے تمام قوانین ان پر نافذ ہوں گے۔ اور وہی کلی طور پر احکام اسلام کے ملتزم ہوں گے۔ یہ قاعدہ اسلامی قانون کے قواعد کلیہ میں سے ہے اور اس پر بہت سے مسائل متفرع ہوتے ہیں۔

(۱)۔ اسی قاعدہ کی بنیاد پر یہ مسئلہ ہے کہ عصمت نفوس و اموال و اعراض صرف انہی مسلمانوں کو حاصل ہے جو دارالاسلام کی حفاظت میں ہوں۔ ان کے سوا دوسرے مسلمانوں کی عصمت محض دینی عصمت ہے عصمت مقومہ نہیں ہے جس کی بنا پر قضاءً شرعی لازم آتی ہے کما قال السرخسی فی کتابہ المبسوط اُلعصمۃ المقومۃ تکون بالاحراز" (جلد ۱۰ صفحہ ۳۰) والعصمۃ بالاحراز والاحراز بالدار لا بالدین (ایضاً ص ۵۳)

۲۔ اسی قاعدہ سے یہ مسئلہ بھی نکلتا ہے کہ اسلامی قانون جن افعال کو حرام قرار دیتا ہے ان سے دارالاسلام کے مسلمان دیناً و قضاءً دونوں حیثیتوں سے روکے جائیں گے، مگر جو مسلمان دارالاسلام میں نہیں ہیں ان کا معاملہ ان کے اور خدا کے درمیان ہے، دین کا احترام دل میں ہو تو باز رہیں اور نہ ہو تو جو چاہیں کریں، اس لیے کہ اسلام کو ان پر نفاذ احکام کا اقتدار حاصل نہیں ہے

ؔ ابتدائی زمانہ میں جب تمام اسلامی مقبوضات ایک ہی حکومت کے ماتحت تھے تو دارالاسلام خلیفۂ اسلام کے حدود سلطنت کا ہم معنی تھا مگر اسلام کے دستوری قانون کی بنیاد جن اصولوں پر رکھی گئی ہے وہ ایسے ہیں کہ جب دارالاسلام ٹکڑے ٹکڑے ہو کر مختلف ریاستوں میں تقسیم ہو گیا تو خود بخود دولت مشترکہ (Common-wealth) کا تصور پیدا ہو گیا۔ ہر اسلامی مقبوضہ خواہ وہ دنیا کے کسی گوشے میں ہو، اور کسی حکمران کے ماتحت ہو، اور اس کا نظام حکومت کسی قسم کا ہو، بہرحال دارالاسلام کا ایک جز ہے۔ اور ہر مسلمان خواہ وہ کہیں پیدا ہوا ہو۔ دارالاسلام میں داخل ہوتے ہی خود بخود اس کی رعیت بن جاتا ہے اور تمام حقوق شہریت (Rights of citizenship) اس کو حاصل ہو جاتے ہیں۔ موجودہ اسلامی حکومتیں خواہ اس پر عمل کریں یا نہ کریں، لیکن اسلامی قانون کی رو سے کوئی مسلمان کسی اسلامی حکومت میں غیر ملکی نہیں ہے۔ ایک افغان کے حقوق اور واجبات ترکی اور ایران میں بھی وہی ہیں جو خود افغانستان میں ہیں۔

(۳) یہی قاعدہ اس مسئلہ کا ماخذ بھی ہے کہ جو نفوس و اموال دارالاسلام کی حفاظت میں ہوں وہ سب معصوم ہیں اس لیے ان پر حق شرعی کے سوا کسی دوسرے طریقہ سے تعدی کرنے کی اجازت نہ دی جائے گی۔ اس بارے میں مسلم اور غیر مسلم کے درمیان کوئی امتیاز نہیں تعدی کرنے سے ہر اس شخص کو روکا جائے گا جو ملتزم احکام اسلام ہو چکا ہو عام اس سے کہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم اور ہر اس شخص کی جان و مال کی حفاظت کی جائے گی جو دارالاسلام کی حفاظت میں ہو خواہ مسلمان ہو یا کافر۔ لان الدین مانع لمن یعتقدہ حقاً للشرع دون من لا یعتقدہ وبقوۃ الدار یمنع عن مالہ من یعتقد حرمتہ ومن لم یعتقدہ (المبسوط ج ۱۴ ص ۵۸) اسی بنا پر دارالاسلام میں کوئی مسلمان مسلمان سے اور کوئی مسلمان ذمی سے اور کوئی ذمی مسلمان سے اور کوئی ذمی ذمی سے اور کوئی حربی مستامن دوسرے مستامن سے سود یا عقود فاسدہ میں سے کسی عقد فاسد پر معاملہ نہیں کر سکتا، کیونکہ سب کے اموال سب کے لیے معصوم ہیں، اور ان کو صرف انہی طریقوں سے لیا جا سکتا ہے جن کو اسلامی قانون جائز رکھتا ہے۔ (فان دخل تجار اھل الحرب دارالاسلام بامان فاشتری احدھم من صاحبہ درھما بدرھمین لم اجز ذلک الا ما اجیزہ بین اھل الاسلام وکذلک اھل الذمۃ اذا فعلوا ذلک لان مال کل واحد منھم معصوم متقوم المبسوط ج ۱۴ ص ۵۸) اسی طرح اگر دارالکفر سے کوئی کافر دارالاسلام میں آئے یا دارالحرب سے کوئی حربی کافر امان لے کر اسلامی ملک میں داخل ہو تو اس سے بھی سود لینا یا عقود فاسدہ پر معاملہ کرنا جائز نہیں، کیونکہ حکومت اسلامی کی امان نے اس کو معصوم الدم والمال کر دیا ہے اور حکومت اسلامی کی امان کا احترام اس کی تمام رعایا پر واجب ہے۔ البتہ اگر کوئی حربی بغیر امان لیے دارالاسلام میں آجائے تو اس کو پکڑنا، لوٹنا، مارنا، اور اس سے عقود فاسدہ پر معاملہ کرنا سب کچھ امام ابو حنیفہ اور امام محمد کے نزدیک جائز ہے، کیونکہ وہ مباح الدم والمال ہے۔ لیکن امام ابو یوسف رحمہ اللہ اس سے عقود فاسدہ پر معاملہ کرنے کو جائز نہیں رکھتے (اس پر تفصیلی بحث آگے آتی ہے)۔

مستامن مسلمان دار الکفر اور دار الحرب میں | دار الاسلام کی رعایا میں سے جو شخص عارضی طور پر دار الکفر یا دار الحرب میں امان لے کر جائے اس کو اسلامی اصطلاح میں "مستامن" کہتے ہیں۔ یہ شخص اگرچہ اسلامی حکومت کے حدود قضا (jurisdiction) سے باہر ہو جانے کی بنا پر اُس پر سے قانون مدنی کی گرفت سے آزاد ہو جاتا ہے مگر پھر بھی اسکو ایک حد تک اسلامی حکومت کا تحفظ (Protection) حاصل رہتا ہے، اور التزام احکام اسلامی کی ذمہ داری اس پر سے بالکل ساقط نہیں ہو جاتی۔ ہدایہ میں ہے:-

العصمۃ الثابتۃ بالاحراز بدار الاسلام لا تبطل بعارض الدخول بالامان کتاب السیر باب المستامن) — دار الاسلام کی حفاظت سے جو عصمت ثابت ہوتی ہے وہ عارضی طور پر امان لے کر داخل ہونے سے باطل نہیں ہو جاتی۔

اس اصل پر حسب ذیل مسائل متفرع ہوتے ہیں۔

(۱) جس دار الکفر سے دار الاسلام کا معاہدہ ہو، وہاں مستامن مسلمان کے لیے عقود فاسدہ پر معاملہ کرنا جائز نہ ہوگا، اس لیے کہ وہاں کے کفار مباح الدم والاموال ہی نہیں ہیں، اور جب عقود فاسدہ کے جواز کی بنا اباحت پر رکھی گئی ہے تو اباحت کے مرتفع ہونے سے وہ چیز آپ سے آپ مرتفع ہو جاتی ہے جو اس پر مبنی ہے۔

(۲) اگر کوئی مستامن مسلمان ایسے دار الکفر میں عقود فاسدہ پر معاملہ کرے یا بد عہدی کرے یا غصب اور سرقہ سے کوئی چیز لے کر آجائے تو قضائے شرعی اس پر جاری نہ ہوگی، نہ اس کے خلاف دار الاسلام میں کسی مقدمہ کی سماعت ہو سکے گی نہ اس پر کوئی ضمان لازم ہوگا۔[۱] البتہ دینی حیثیت سے اس کو ان تمام افعال سے رجوع کا مشورہ دیا جائے گا جو اس نے شریعت کے خلاف کیے ہیں۔

(۳) عقود فاسدہ کو مستثنیٰ کر کے باقی تمام معاملات میں اُس مستامن کے لیے بھی حنفی فقہ کے

---

[۱] یہ صرف ان صورتوں میں ہے جب کہ معاہدہ میں کوئی شرط اس کے متعلق نہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اسلامی قانون کے تحت نفس فعل کی بنا پر اس مسلمان سے کوئی باز پرس نہ کی جائے گی۔ باز پرس اگر ہو سکتی ہے تو وہ صرف شرائط معاہدہ کے تحت ہو سکتی ہے۔

یہی احکام ہیں جو "دار الحرب" میں امان لے کر داخل ہوا ہو۔

لو دخل الیھم تاجر بامان فسرق منھم جاریۃ واخرجھا .... فھو مامور بردھا علیھم فیما بینہ و بین ربہ وان کان لایجبرہ الامام علیٰ ذٰلک (المبسوط ج ۱۰ ص ۶۱)

اگر کوئی تاجر دار الحرب میں امان لے کر جائے اور ان کے ہاں سے کوئی لونڈی چرا لائے .... تو فیما بینہ و بین اللہ وہ اسے واپس کرنے پر مامور ہے اگرچہ امام اس کو ایسا کرنے پر مجبور نہ کرے گا۔

واذا دخل المسلم دار الحرب بامان فدانیھم اوداینوہ او غصبھم او غصبوہ لم یحکم فیما بینھم بذٰلک .... وانہ ضمن المستامن لھم ان لایخونھم وانما غدر بامان نفسہ دون الامام فیفتی بالرد ولا یجبر علیہ فی الحکم (ایضاً ص ۹۵)

اگر مسلمان دار الحرب میں امان لے کر داخل ہو اور ان سے قرض لے یا وہ اس سے قرض لیں، یا وہ ان کا مال غصب کرے یا وہ اس کا مال غصب کریں تو ان کے درمیان دار الاسلام میں کوئی فیصلہ نہ کیا جائے گا۔ .... مستامن نے بطور خود ان سے خیانت نہ کرنے کا ذمہ لیا تھا، اور اب جو اس نے غدر کیا تو یہ امام کے معاہدہ میں نہیں بلکہ خود اپنے ذاتی معاہدہ میں غدر کیا ہے اس لیے اس کو واپس کرنے کا فتویٰ دیا جائے گا مگر حکماً اس پر مجبور نہ کیا جائے گا۔

(امام ابو یوسف کو اس سے اختلاف ہے کیونکہ وہ مسلمان کو ہر جگہ ملتزم احکام اسلام قرار دیتے ہیں)

اگر کوئی مستامن مسلمان دار الحرب میں کسی کو قتل کرے یا اس کے مال کو نقصان پہونچائے تو دار الاسلام میں اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے گی۔ البتہ اس کے دین کے لحاظ سے ایسا کرنا اس کے لیے ناجائز ہے واکرہ للمسلم المستامن الیھم فی دینہ ان یغدر بھم لان الغدر حرام (ایضاً ص ۹۶)

اگر مستامن مسلمان دار الحرب سے غصب کرکے یا چرا کر کوئی مال لے آئے تو مسلمان کے لیے اس کو خریدنا مکروہ ہے لیکن اگر وہ خرید لے تو یہ بیع رد نہ کی جائے گی کیونکہ قانوناً نفس بیع و شراء میں کوئی نقص نہیں البتہ اصلاً چونکہ یہ مال غدر ہے اس لیے وہ مسلمان اپنے دین کے لحاظ سے اس کو واپس کرنے پر مامور ہے

والنھی عن الشراء منه لیس لمعنی فی عین الشراء فلا یمنع جوازہ وھھنا الکراھة لمعنی الغدر وکونه مامورًا برد ھا علیھم دیناً (۹۷)

(۴) مستامن مسلمان "دار الحرب" میں اہل حرب سے سود لے سکتا ہے، جوا کھیل سکتا ہے خمر اور خنزیر اور مردار ان کے ہاتھ بیچ سکتا ہے اور تمام ان طریقوں سے ان کا مال لے سکتا ہے جن پر خود اہل حرب راضی ہوں۔ یہ امام ابوحنیفہ اور امام محمد کا مذہب ہے۔ امام ابو یوسف اس سے اختلاف کرتے ہیں فریقین کے دلائل جو امام سرخسی نے نقل کیے ہیں لائق غور ہیں:۔

"مستامن کے لیے اہل حرب سے سود پر نقد یا قرض معاملہ کرنا یا خمر یا خنزیر اور مردار ان کے ہاتھ فروخت کرنا ابوحنیفہ اور محمد رحمہما اللہ کے نزدیک جائز ہے مگر ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک ناجائز ہے کیونکہ مسلمان ملتزم احکام اسلام ہے خواہ کہیں ہو اور اس نوع کے معاملہ کی حرمت اسلام کے احکام میں سے ہے۔ کیا نہیں دیکھتے کہ اگر حربی مستامن سے ہمارے دار میں ایسا معاملہ کیا جائے تو جائز نہ ہوگا۔ پس جب یہاں یہ ناجائز ہے تو دار الحرب میں بھی ناجائز ہونا چاہیے۔ اس کے جواب میں مقدم الذکر دونوں امام فرماتے ہیں کہ یہ تو کافر کے مال کو اس کی مرضی سے لینا ہے، اور اس کی اصل یہ ہے کہ ان کے اموال ہمارے لیے مباح ہیں۔ مستامن نے ذمہ داری صرف اس قدر لی تھی کہ ان سے خیانت نہ کرے گا۔ مگر جب اس نے ان عقود کے ذریعہ سے اس کی رضا کے ساتھ یہ مال لیا تو غدر سے تو یوں بچ گیا اور حرمت سے اس طرح بچا کہ یہ مال اس نے عقد کے اعتبار سے نہیں بلکہ

اباحت کی اصل پر لیا ہے۔ رہا دارالاسلام میں حربی مستامن کا معاملہ تو وہ اس سے مختلف ہے، کیونکہ اس کا مال امان کی وجہ سے معصوم ہو گیا ہے اس لیے اباحت کی بنا پر اس کو نہیں لیا جا سکتا (المبسوط ج ۱۰ ص ۹۵)"

"امام ابو حنیفہ نے فرمایا کہ جب مسلمانوں کیلیے اہل حرب کے اموال کو لوٹنا اور چھین لینا حلال ہے تو ان کی مرضی سے لینا بدرجۂ اولیٰ حلال ہونا چاہیے مطلب یہ ہے کہ لشکر اسلام کے حدود سے باہر ان کے لیے کوئی امان نہیں ہے، لہٰذا مسلمانوں کے لیے ہر ممکن طریقہ سے ان کا مال لینا جائز ہے" (المبسوط ج ۱۴ ص ۱۳۸)

"امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ مسلمان چونکہ اہل دارالاسلام میں سے ہے اس لیے وہ حکم اسلام کی بنا پر ہر جگہ ربوٰ سے ممنوع ہے۔ اس کے فعل کی یہ توجیہ درست نہیں کہ وہ کافر کے مال کو بطیب نفس لے رہا ہے بلکہ وہ اس کو دراصل اس خاص صورت معاملہ کی بنا پر لیتا ہے کیونکہ اگر وہ خاص صورت معاملہ (یعنی عقد فاسد) نہ ہو تو کافر اس کو کسی دوسری صورت سے اپنا مال دینے پر راضی نہ ہوگا اگر دارالحرب میں ایسا کرنا جائز ہو تو مسلمانوں کے درمیان دارالاسلام میں بھی اس طرح کا معاملہ جائز ہوگا کہ ایک شخص ایک درہم کے بدلے دو درہم دے اور دوسرے درہم کو ہبہ کے نام سے موسوم کردے" (المبسوط ج ۱۴ ص ۵۸)

ہمارا مقصود دونوں اقوال میں محاکمہ کرنا نہیں ہے۔ ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ خود امام ابو حنیفہ کے مذکورۂ بالا اقوال اور ان کے مذہب کے دوسرے مسائل سے جو ہم پہلے نقل کر چکے ہیں چار باتیں صاف طور پر ثابت ہوتی ہیں۔

اولاً یہ معاملہ صرف اس مسلمان کے لیے جائز ہے جو دارالاسلام کی رعایا ہو اور امان لے کر جائے۔

ثانیاً یہ معاملہ ان حربی کافروں سے کیا جا سکتا ہے جن کے نفوس و اموال مباح ہیں۔

ثالثاً اس طریقہ سے جو مال لیا جائے گا وہ غنیمت نہ ہوگا۔ اس لیے کہ نہ تو وہ اشرف الجہات سے ہے نہ اس میں دین کا اعزاز ہے، نہ اس میں خمس ہے۔ بلکہ وہ مجرد اکتساب مال ہے اسی طرح وہ فے بھی نہیں ہے کیونکہ

حکومت اسلام کی ملک ہوتی ہے اور یہ مال وہ شخص خود لیتا ہے۔ بیت المال میں داخل نہیں ہوتا۔

رابعاً اس طریقہ سے کفار کا مال لینا صرف جواز قانونی کے درجہ میں ہے، بلکہ جواز کی آخری حد پر ہے اور اسکی قانونی حیثیت صرف اتنی ہے کہ اگر مسلمان ایسا کرے گا تو امام صاحب کی رائے میں دیناً بھی اس کو یہ مال واپس کرنیکا فتویٰ نہ دیا جائیگا، بخلاف مال غدر کے کہ اگرچہ قضاءً اسے واپسی پر مجبور نہ کیا جائیگا مگر دیناً اس کو واپس کر دینے کا حکم دیا جائیگا۔

۵- مستامن مسلمان جس طرح دار الحرب کے کافروں سے عقود فاسدہ پر معاملہ کر سکتا ہے اسی طرح وہاں کے مسلمان باشندوں سے بھی ایسا معاملہ کرنے کا مجاز ہے، کیونکہ ان کے اموال بھی مباح ہیں۔ اس کے حوالے ہم اس سے پہلے درج کر چکے ہیں۔

دارالکفر اور دارالحرب کی مسلم رعایا

وہ مسلمان جو دارالکفر میں رہیں اور دارالاسلام کی طرف ہجرت نہ کریں اسلام کی حفاظت سے خارج ہیں۔ اگرچہ اسلام کے تمام احکام اور حدود حلال وحرام کی پیروی مذہباً ان پر لازم ہے لیکن اسلام ان کی ذمہ داری سے بری ہے جیسا کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دیا ہے۔ غنیمت اور فے میں ان کا سرے سے کوئی حصہ ہی نہیں جیسا کہ بصراحت حدیث میں مذکور ہے۔ اور دنیوی حیثیت سے ان کے نفوس واصول غیر معصوم ہیں، کیونکہ عصمت مقومہ ان کو حاصل نہیں۔

اگر ایسے مسلمان "حربی" قوم سے ہوں تو گویا مباح الدم والاموال ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے قاتل پر قصاص کیا معنی دیت بھی نہیں بلکہ بعض حالات میں کفارہ تک نہیں۔ اس باب میں فقہاء حنفیہ کے چند اقوال ہم بے کم وکاست نقل کر دیتے ہیں جن سے دار الحرب کی مسلمان رعیت کا قانونی مقام آپ خود ہی معلوم ہو جائے گا۔

لاقیمة لدم المقیم فی دار الحرب بعد اسلامه قبل الهجرة الینا.... اجرده اصحابنا مجری الحربی فی اسقاط الضمان	جو شخص مسلمان ہونے کے بعد ہجرت نہ کرے اور دار الحرب میں مقیم رہے اس کے خون کی کوئی قیمت نہیں..... ہمارے اصحاب نے اس کو حربی کے درجہ میں قرار دیا ہے

عن متلف ماله.... ماله كمال الحربي من هذا الوجه ولذلك اجاز ابو حنيفة مبايعته على سبيل ما يجوز مبايعة الحربي من بيع الدرهم بالدرهمين في دار الحرب (احكام القرآن للجصاص الحنفي ج ۲ صـ ۲۹)	اس حیثیت سے کہ اس کے مال کو نقصان پہونچانے والے پر کوئی ضمان نہیں..... اس کا مال اس لحاظ سے حربی کے مال کی طرح ہے اسی لیے ابوحنیفہ نے اس کے ساتھ بھی خرید و فروخت کی وہ صورت جائز رکھی ہے جو حربی کے ساتھ جائز رکھی ہے، یعنی دار الحرب میں ایک درہم کو دو درہم کے عوض بیچنا (سود)۔
من في دار الحرب في حق من هو في دار الاسلام كالميت (المبسوط ج ۱۰ صـ ۶۴)	جو شخص دار الحرب میں ہے وہ دار الاسلام والے کے لیے گویا مُردہ ہے۔
ان تترسوا باطفال المسلمين فلا باس بالرمي اليهم وان كان الرامي يعلم انه يصيب المسلم...... ولا كفارة عليه ولا دية (ايضاً صـ ۶۵)	اگر اہل حرب مسلمانوں کے بچوں کو ڈھال بنائیں تو ان پر نشانہ لگانے میں کوئی حرج نہیں اگرچہ نشانہ لگانے والا جانتا ہو کہ مسلمان کو نشانہ بنا رہا ہے ... اس پر نہ دیت ہے نہ کفارہ۔
واذا اسلم الحربي في دار الحرب ثم ظهر المسلمون على تلك الدار ترك له ما في يديه من ماله ورقيقه وولده الصغار... فاما عقاره فانها تصير غنيمة للمسلمين في قول ابي حنيفة ومحمد وقال ابو يوسف استحسن فاجعل عقاره له (ايضاً صـ ۶۶)	اگر حربی دار الحرب میں مسلمان ہو پھر اس دار پر مسلمان فتح پائیں تو اس کا مال اور اس کے غلام اور اس کے نابالغ بچے چھوڑ دیے جائیں گے.... مگر اس کی غیر منقولہ جائداد مسلمانوں کے لیے غنیمت قرار دی جائیگی۔ یہ ابوحنیفہ اور محمد کا قول ہے۔ ابو یوسف کہتے ہیں کہ احسان کے طور پر غیر منقولہ جائداد بھی اس کے پاس رہنے دی جائے۔

واکرہ للرجل ان یطأ امتہ او امرأتہ فی دار الحرب مخافۃ ان یکون لہ فیھا نسل لانہ ممنوع من التوطن فی دار الحرب ..... واذا خرج ربما یبقی لہ نسل فیتخلق ولدہ باخلاق المشرکین۔ (ایضاً ص ۵)

امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ میں ایک شخص کے لیے اس کو بھی مکروہ سمجھتا ہوں کہ دار الحرب میں اپنی لونڈی یا بیوی سے مباشرت کرے خوف ہے کہ کہیں وہاں اس کی نسل نہ پیدا ہو کیونکہ مسلمانوں کے لیے دار الحرب کو وطن بنانا ممنوع ہے..... اور اس لیے کہ اگر وہ وہاں سے نکل آیا اور اپنی نسل وہاں چھوڑ آیا تو اس کی اولاد مشرکین کے اخلاق اختیار کرے گی۔

آخری بات جو اس سلسلہ میں ڈرتے ڈرتے ہم بیان کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ امام اعظم کی رائے میں دار الحرب کے مسلمان باشندوں کے لیے ایک دوسرے سے سود کھانا مکروہ ہے، لیکن اگر وہ ایسا معاملہ کریں تو اس کو رد نہ کیا جائے گا۔ اس رائے سے امام محمد نے بھی اختلاف کیا ہے اور ان کی دلیل یہ ہے کہ ان دونوں مسلمانوں کا مال معصوم عن التملک بالاخذ ہے۔ جب مسلمان اس ملک پر فتح پانے کی صورت میں ان کے مال کو غنیمت قرار نہیں دے سکتے تو ان دونوں کو ایک دوسرے کا مال غنیمت کے طور پر لینے کا کیا حق ہے۔ لیکن امام ابوحنیفہ رحمہ نے اپنی رائے کی تائید میں جو قانونی استدلال کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف قانونی حیثیات کے پیچیدہ اور نازک فروق کو سمجھنے میں امام صاحب کا تفقہ کس قدر بڑھا ہوا تھا۔ ہم اس بیان کو لفظ بلفظ نقل کرتے ہیں۔ کیونکہ اس سے ایک اہم اصل قانونی پر روشنی پڑتی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

بالاسلام قبل الاحراز تثبت العصمۃ فی حق الامام دون الاحکام الا تری ان احدھما لو اتلف مال صاحبہ

دار الاسلام کی حفاظت میں آنے سے پہلے محض اسلام سے جو عصمت ثابت ہوتی ہے وہ صرف امام کے حق میں ہے مگر احکام میں نہیں ہے۔ دیکھتے نہیں ہو کہ اگر ان دونوں

او نفسہ لم یضمن وھو آثم فی ذلک و انما تثبت العصمۃ فی حق الاحکام بالاحراز والاحراز بالدار لا بالدین لان الدین مانع لمن یعتقدہ حقا للشرع دون من لا یعتقدہ۔ وبقوۃ الدار یمنع عن مالہ من یعتقد حرمتہ ومن لم یعتقدہ فلثبوت العصمۃ فی حق الاثم قلنا یکرہ لھما ھذا الصنیع ولعدم العصمۃ فی حق الحکم قلنا لا یجبر ان یرد ما اخذہ لان کل واحد منھما انما یملک مال صاحبہ بالاخذ۔ (المبسوط ج ۴ [illegible])

مسلمانوں میں سے ایک شخص دوسرے کا مال یا جان تلف کر دے تو اس پر ضمان نہ ہوگا حالانکہ وہ ایسا کرنے میں گناہگار ہوگا۔ بات دراصل یہ ہے کہ احکام میں عصمت صرف احراز ہی سے ثابت ہوتی ہے اور احراز (حفاظت) دار کے سبب سے ہے نہ کہ دین کے سبب سے۔ دین تو حق شرع کے لحاظ سے صرف ان لوگوں کو روکتا ہے جو اس پر اعتقاد رکھتے ہوں اور ان کو نہیں روکتا جو اسے نہ مانتے ہوں بخلاف اس کے دار کی قوت سے آدمی کی حفاظت اس کے مقابلہ میں بھی کی جاتی ہے جو اس کی حرمت کا اعتقاد رکھتا ہے اور اس کے مقابلہ میں بھی جو ایسا اعتقاد نہیں رکھتا۔ پس گناہ ہونے کی حیثیت سے جو عصمت ثابت ہے اس کی بنا پر ہم نے کہا کہ ایسا کرنا مکروہ ہے۔ اور چونکہ قانونی حیثیت کے لحاظ سے عصمت ثابت نہیں ہے اس کی بنا پر ہم نے کہا کہ اس کو لیا ہوا مال واپس کرنے کا حکم نہ دیا جائے گا کیونکہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کا مال جب لیتا ہے تو محض لے لینے ہی کی وجہ سے اس کا مالک ہو جاتا ہے۔

یہاں امام صاحب نے اسلامی قانون کے تینوں شعبوں کی طرف اشارات کر دیے ہیں۔ اعتقادی قانون کے لحاظ سے مسلمان کا مال بلا لحاظ اس کے کہ وہ دارالاسلام میں ہو یا دارالکفر میں یا دارالحرب میں بہرحال معصوم ہے اور اس عصمت کا مآل یہ ہے کہ اس سے تعدّی کرتے ہوئے طریق غلط سے لینے والا گناہگار ہوگا۔ دستوری قانون کے لحاظ سے دارالاسلام میں رہنے والے کافر کے مال کو بھی عصمت حاصل ہے

وہ دارالکفر میں رہنے والے مسلمان کو حاصل نہیں، اس لیے اگر دارالکفر کا کوئی دوسرا مسلمان اس کو حرام طریقہ سے دے لے تو خدا کے ہاں گنہگار ہوگا مگر دنیا میں اس پر اسلامی حکم جاری نہ ہوگا۔ تعلقات خارجیہ کے قانون کی نگاہ میں کفار کے درمیان رہنے والا مسلمان اپنے عمرانی حقوق اور واجبات کے لحاظ سے انہی کافروں کا شریک حال ہے اس لیے وہ بھی اسی طرح نفسِ اخذ سے مال کا مالک ہوجاتا ہے جس طرح خود کفار مالک ہوتے ہیں۔ پس اگر اس بنیاد پر دارالکفر میں مسلمان مسلمان سے سود کھائیں یا مسلمان کافر سے اور کافر مسلمان سے سود کھائیں تو وہ ان اموال کے مالک تو ہوجائیں گے اور ان کو واپس کرنے کا حکم بھی نہ دیا جائے گا، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ سود کھانے اور کھلانے والے مسلمان گناہ گار نہ ہوں گے۔

قول فصل | یہاں تک ہم نے قانون اسلامی کی جو تفصیلات درج کی ہیں ان سے جناب مولانا مناظر احسن صاحب کے استدلال کی پوری بنیاد منہدم ہوجاتی ہے۔ ان سے ثابت ہوتا ہے کہ:-

(۱) تمام غیر ذمی کافر مباح الدم والاموال نہیں ہیں، بلکہ اباحت صرف ان کافروں کے خون اور مال کی ہے جو برسرِ جنگ ہوں۔ لہٰذا اگر سود لینا اور عقودِ فاسدہ پر معاملہ کرنا جائز ہے تو صرف محاربین کے ساتھ ہے، اور ایسا کرنے کا حق صرف ان مسلمانوں کو پہنچتا ہے جو دارالاسلام کی رعیت ہوں، جن کی سرکار نے کسی دارالکفر کو دارالحرب قرار دیا ہو، اور جو دارالحرب میں امان لے کر تجارت وغیرہ اغراض کے لیے داخل ہوئے ہوں۔

(۲) دارالکفر اول تو ہر حال میں دارالحرب نہیں رہتا، اور اگر اعتقادی قانون کے لحاظ سے وہ دارالحرب سمجھا جائے تو اس کے مدارج مختلف ہیں اور ہر درجہ کے احکام الگ الگ ہیں۔ ایک ہی معنی میں تمام غیر اسلامی مقبوضات کو دارالحرب سمجھنا اور ان میں علی الدوام وہ احکام جاری کرنا جو خاص حالت جنگ کے لیے ہیں، قانون اسلامی کی اسپرٹ ہی کے خلاف نہیں بلکہ صریح ہدایات

کے بھی خلاف ہے اور اس کے نتائج نہایت خطرناک ہیں۔ اباحت نفوس واموال کی بنا پر جو جزئیات متفرع ہوتے ہیں، وہ صرف اسی زمانہ تک ناخذ رہ سکتے ہیں جب تک کسی دارالکفر کے ساتھ حالت جنگ قائم رہے۔ پھر ان تمام احکام کا تعلق خود دارالحرب کی مسلمان رعایا سے نہیں بلکہ اس دارالاسلام کی رعایا سے ہے جو برسر جنگ ہو۔

(۳) ہندوستان عام معنی میں اس وقت سے دارالکفر ہوگیا ہے جب سے انگریزی حکومت کا استیلاء اس پر مکمل ہوا ہے جس زمانہ میں شاہ عبدالعزیز صاحب نے جواز سود کا فتوی دیا تھا، اس زمانہ میں واقعی مسلمانان ہند کے لیے دارالحرب تھا اس لیے کہ انگریزی قوم اسلامی حکومت کو مٹانے کے لیے جنگ کر رہی تھی جب اس کا استیلاء مکمل ہوگیا اور مسلمانان ہند نے اس کی غلامی قبول کر لی تو یہ ان کے لیے دارالحرب نہیں رہا۔ ایک وقت میں یہ افغانستان کے مسلمانوں کے لیے دارالحرب تھا۔ ایک زمانہ میں ترکوں کے لیے دارالحرب ہوا، مگر اب دارالاسلام کی تمام حکومتوں کے لیے دارالصلح ہے۔ ان حکومتوں کی رعایا میں سے بھی کوئی شخص یہاں سود کھانے اور عقود فاسدہ پر معاملہ کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ البتہ سرحد کے آزاد علاقہ والے اس کو اپنے لیے دارالحرب سمجھ سکتے ہیں (اور اگر وہ یہاں عقود فاسدہ پر معاملات کریں تو حنفی قانون کی رو سے ان کے فعل کو جائز کہا جا سکتا ہے لیکن یہ جواز محض قانونی جواز ہے۔ خدا کی نظر میں وہ مسلمان ہرگز مقبول نہیں ہو سکتا جو اپنے آپ کو مسلمان بھی کہتا ہو اور پھر سود خواری سے، مے فروشی سے، قمار بازی سے، سور کے گوشت اور مردار چیزوں کی تجارت سے اسلام کو غیر قوموں کے سامنے رسوا بھی کرتا پھرے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کوئی شخص اپنے قرض دار بھائی کو گرفتار کرائے اور سول جیل بھجوا دے دراں حالیکہ اسے معلوم ہو کہ اس کے قبضہ میں درحقیقت کچھ نہیں ہے اور اس کے بچے کل بھوکوں مر جائیں گے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ قرض خواہ کو ایسا کرنے کا حق ہے۔ اور جو کچھ وہ کر رہا ہے قانونی جواز کی حد میں کر رہا ہے۔ مگر اس سے کون انکار

کر سکتا ہے کہ یہ قانونی جواز کی بالکل آخری سرحد ہے، اور جو انسان قانون کی آخری سرحدوں پر رہتا ہے وہ بسا اوقات جانوروں سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔

(۴) ہندوستانی مسلمانوں کی حیثیت ہرگز وہ نہیں ہے جس کے لیے فقہی زبان میں "مستامن" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ مستامن کے لیے پہلی شرط دارالاسلام کی رعایا ہونا ہے اور دوسری شرط یہ ہے کہ اس کا قیام ایک قلیل مدت کے لیے ہو۔ حنفی قانون میں حربی مستامن کے لیے دارالاسلام کے اندر رہنے کی زیادہ سے زیادہ مدت ایک سال یا اس سے کچھ زیادہ رکھی گئی ہے اس کے بعد وہ قانون تبدیل جنسیت (Law of naturalisation) کی رو سے اس کو ذمی بنا لیتا ہے۔ اسی پر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مسلمان مستامن کے لیے بھی دارالحرب میں قیام کرنے کی مدت سال دو سال سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ اسلامی شریعت جو مسلمانوں کو دارالاسلام میں سمیٹنے اور کافروں کو ذمی بنانے کے لیے سب سے زیادہ حریص ہے، کبھی اس کی اجازت نہیں دیتی کہ کوئی شخص دارالحرب کو اپنا وطن بنالے اور وہاں نسلوں پر نسلیں پیدا کرتا رہے اور پھر بھی مستامن رہے، اور اس حیثیت میں زندگی بسر کرتا چلا جائے جو مستامن کے لیے مقرر کی گئی ہے۔ پھر جب یہ ایک شخص کے حق میں جائز نہیں، تو ۷ کروڑ کی عظیم الشان آبادی کے لیے کب جائز ہو سکتا ہے کہ قرنوں تک "مستامن" کی سی زندگی بسر کرے اور ایک طرف ان اباحتوں سے فائدہ اٹھاتی رہے جو حالات "استیمان" کے لیے عارضی طور پر منتشر افراد کو محض جنگی ضروریات کے لیے دی گئی تھیں، اور دوسری طرف وہ تمام قیود اپنے اوپر عائد کرلے جو مستامن کو عارضی طور پر اسلامی قانون کی پابندی سے آزاد کرکے کفار کے قوانین کا پابند بناتی ہیں۔

(۵) مسلمانان ہند کی صحیح قانونی پوزیشن یہ ہے کہ وہ ایک ایسی قوم ہیں جس پر کفار مستولی ہو گئے ہیں۔ ان کا دار جو کبھی دارالاسلام تھا اب دارالکفر بن گیا ہے مگر دارالاسلام کے کچھ آثار ابھی باقی ہیں۔ ان کا فرض ہے کہ یا تو کسی دارالاسلام میں منتقل ہو جائیں، یا اگر اس پر قادر نہیں تو اس ملک میں جو اسلامی آثار باقی ہیں ان کی سختی کے ساتھ حفاظت کریں اور جتنی تدابیر ممکن ہوں وہ سب اسے دوبارہ دارالاسلام بنانے میں صرف کر دیں۔ احکام کفر کے تحت جو زندگی وہ بسر کر رہے ہیں اس کا ہر سانس ایک گناہ ہے۔ کیا باقی ماندہ آثار اسلامی کو بھی مٹا کر اس گناہ میں مزید اضافہ کرنا منظور ہے؟

تقریظ و انتقاد

"تحقیق قربانی"

اس مرتبہ "اشارات" کے سلسلہ میں ان لوگوں کے خیالات پر اظہار رائے کیا جا چکا ہے جو "قربانی" کے خلاف کچھ مدت سے جدوجہد کر رہے ہیں۔ وہ صفحات پریس جا چکے تھے کہ رسالہ بلاغ، امرتسر کا تازہ پرچہ (بابتہ ماہ ذی القعدہ ۵۵ھ) وصول ہوا جس میں جناب عرشی امرتسری نے "تحقیق قربانی" کے عنوان سے قربانی پر اپنی تحقیق پیش فرمائی ہے۔ اس مضمون میں قربانی کے خلاف جو دلائل پیش کیے گئے ہیں اگرچہ ان میں سے اکثر کا جواب ...... اشارات میں آگیا ہے، لیکن پھر بھی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اس "تحقیق قربانی" پر مفصل تبصرہ کیا جائے۔

فاضل مضمون نگار نے اپنی تحقیق کی ابتدا انسائکلوپیڈیا برٹانیکا کے ایک اقتباس سے کی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ قربانی کے متعلق "قدیم انسان" کا نظریہ کیا تھا، روم اور یونان میں قربانی کی رسم کن عقائد پر مبنی تھی، سامی مذاہب میں یہود کا کیا عقیدہ تھا، "دور ثانی میں جب انسان دیوتاؤں کی حقیقت سے واقف ہو گیا" تو اس نے قربانی کی رسم کن تاویلوں کے ساتھ باقی رکھی، یہود کے ربی اور یونان کے فلسفی خدا اور ارواح کے متعلق کیا عقیدہ رکھتے تھے اور قربانی کے ساتھ اس عقیدہ کا رابطہ کس قسم کا تھا۔ قدیم آریوں اور اہل روم اور اہل عرب میں قربانی کی کیا رسمیں تھیں۔ پھر مسیحیت نے کس طرح قربانی کا ابطال کیا اور جاہلیت کے ان خیالات کو جو انسانی اقوام میں پھیلے ہوئے تھے، کس طرح مٹایا اور یہ عاقلانہ تخیل انسانوں میں پیدا کیا کہ "غربا کو کچھ دینا قربانی کے برابر ہے" اور "جو خیرات دیتا ہے وہ گویا سلامتی کی قربانی خدا کو پیش کرتا ہے"۔ یہ تمام بیانات جو تمہید کے طور پر بیسویں صدی کی کتاب مقدس" سے نقل کیے گئے ہیں، بلاشبہ ہماری معلومات میں بیش قیمت اضافہ کرتے ہیں، مگر ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ ان کو اس مضمون میں کیوں نقل کیا گیا ہے۔

اول تو یہ تمام بحث غیر متعلق ہے اس لیے کہ نفس مسئلہ صرف یہ ہے کہ آیا خدا اور رسول نے قربانی کا حکم دیا ہے یا نہیں؟ اگر ثابت ہو جائے کہ نہیں دیا ہے تو انسائکلوپیڈیا کی شہادت قطعاً غیر ضروری ہے۔ اور اگر تحقیق سے یہ ثابت ہو کہ قربانی ایک سنتِ اسلام ہے اور خدا اور رسول کے حکم سے جاری ہوی ہے، تو مسلمان کو بہر حال اس کا اتباع کرنا چاہیے۔ خواہ انسائکلوپیڈیا برٹانیکا کی رو سے وہ کیسی ہی جہالت اور تاریک خیالی ہو، اس لیئے کہ اسلام کا اتباع کسی انسائکلوپیڈیا کی موافقت پر موقوف نہیں ہے اور نہ ہونا چاہیے۔

ثانیاً یہ بات حیرت انگیز ہے کہ جو لوگ اپنے آپ کو قرآن کا مبلغ کہتے ہیں اور جن کا دعوی یہ ہے کہ ہم قرآن کے سوا کسی چیز کے متبع نہیں ہیں وہ ایک مذہبی مسئلہ کی تحقیق میں یورپ کی تحقیق کو مقدم رکھتے ہیں۔ اگر قربانی کی تاریخ اور جاہلیت اولی کے اعتقادات ہی پر کچھ روشنی ڈالنی تھی تو اس کے متعلق خود قرآن میں کافی مواد موجود تھا، اور اس سے یہ بھی معلوم ہو سکتا تھا کہ جاہلیت کی قربانی اور اسلام کی قربانی میں فرق کیا ہے؟ لیکن جناب عرشی نے قرآن کو چھوڑ کر محققین یورپ کی طرف توجہ فرمائی اور سب سے پہلے انہی سے دریافت کیا کہ یہ قربانی جو ۱۳ سو برس سے اہل اسلام میں رائج ہے اس کی اصلیت تمہاری تحقیق میں کیا ہے؟ یہ شرف تقدم جو ایک اسلامی مسئلہ کی تحقیق میں اہل فرنگ کے علم و رائے کو عطا کیا گیا ہے، اس کی وجہ اگر ہم بیان کریں گے تو ہم پر بدگمانی کا الزام عائد ہوگا، اس لیے جناب عرشی خود ہی اس پر روشنی ڈالیں تو زیادہ بہتر ہو۔ ہم صرف اتنا عرض کریں گے کہ جن "محققین" کے خیالات کو آپ نے مسئلہ قربانی میں اپنی تحقیق کا نقطۂ آغاز قرار دیا ہے اگر آپ اجازت دیں تو ہم اسلام کے اصول و ارکان بلکہ خود اسلام اور نبوت اور وحی اور قرآن کے متعلق بھی ان کی تحقیقات پیش کریں اور آپ سے دریافت کریں کہ ان کی نظر سے آپ اسلام کی کس کس چیز کو دیکھنے کے لیے تیار ہیں؟

ثالثاً یہ بات بھی کچھ کم قابل تعجب نہیں کہ جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل اور آپ کے اسوۂ حسنہ کے متعلق بخاری اور مسلم اور موطا اور تمام دوسری کتب حدیث کی شہادتیں بے تکلف رد فرما دیتے ہیں ان کے معیار تنقید پر "قدیم انسان" اور روم و یونان اور اُمم سامیہ اور اقوام آریہ کے متعلق محققین فرنگ کے بیانات کس طرح پورے اتر جاتے ہیں، حالانکہ ان کا زمانہ عصر نبوت سے سینکڑوں ہزاروں سال قبل کا ہے، اور ان کے متعلق جو تاریخی شہادتیں آج دنیا میں موجود ہیں وہ ان تاریخی شہادتوں کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں رکھتیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے متعلق پائی جاتی ہیں۔ جن ذرائع پر اعتماد کر کے آپ پرانی قوموں کے احوال پر عالمانہ کلام فرما رہے ہیں، "ان میں سے کوئی قوی سے قوی ذریعہ بھی بخاری و مسلم کی کسی ضعیف سے ضعیف روایت کے مقابلہ میں نہیں لایا جا سکتا۔ پس جب آپ ان ذرائع سے استناد فرماتے ہیں اور ان کی سند پر ہم کو خبر دیتے ہیں کہ "قدیم انسان" یہ کرتا تھا۔ اور سامی مذاہب میں یہ عقیدہ تھا اور روم و یونان والے یہ خیالات رکھتے تھے تو ہم کو بھی اجازت ہو کہ بخاری اور مسلم کی سند پر یہ عرض کریں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل تھا اور حضور نے فلاں مسئلہ میں فلاں حکم دیا تھا۔ اگر اس کو ماننے سے آپ انکار فرمائیں گے تو ہم آپ سے صرف اتنا دریافت کریں گے کہ الیس منکم رجل رشید ؟

قربانی کے متعلق انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کی تحقیقات سے فاضل مضمون نگار جس نتیجہ پر پہنچے ہیں وہ یہ ہے :۔

"ترقی تہذیب نے قربانی کی کراہت واضح کر دی"

اس فقرہ کا مفہوم غالباً اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ قربانی دراصل ایک مکروہ چیز ہے۔ قدیم زمانے میں جہالت کی وجہ سے اس کی کراہت لوگوں سے مخفی تھی۔ مگر اب چونکہ تہذیب ترقی کر چکی ہے اس لیے اس کا مکروہ ہونا واضح ہو گیا ہے۔ یہ الفاظ پیش نظر رکھیے اور پھر سورۂ حج کی وہ آیت ملاحظہ فرمائیے جس میں

ارشاد ہوا ہے :-

"اور قربانی کے اونٹوں کو ہم نے تمہارے لیے اللہ کے شعائر میں سے قرار دیا ہے۔ تمہارے لیے ان میں بھلائی ہے لہٰذا تم ان کو صف بستہ کھڑا کرکے ان پر اللہ کا نام لو (یعنی ذبح کرو) اور جب وہ کسی پہلو پر گر جائیں تو ان میں سے خود کھاؤ اور قانع اور سائل کو بھی کھلاؤ (رکوع ۵)

ہر شخص جس کو خدا نے تھوڑی سی عقل بھی عطا فرمائی ہے بیک نظر محسوس کرے گا کہ ان دونوں عبارتوں میں صریح منافات ہے۔ سورۂ حج میں جس چیز کو شعائر اللہ میں سے قرار دیا گیا ہے اور جسے ایک کارِ خیر کی حیثیت سے کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اسی کو مقدم الذکر عبارت ناگزیر ٹھیراتی ہے اور ہم کو یہ خبر دیتی ہے کہ اسے کارِ خیر سمجھنے کا خیال اُس زمانہ کے جاہل انسانوں میں پایا جاتا تھا جب تہذیب نے ترقی نہ کی تھی۔ چھوڑ دیجیے اس سوال کو کہ قربانی واجب ہے یا نہیں؟ ہر شہر اور قریہ میں کرنی چاہیے یا صرف مقام منیٰ میں؟ قربانی کرنا افضل ہے یا اس کے بدلے میں کچھ اور خیرات کر دینا؟ سوال یہ ہے کہ اگر کسی درجہ میں بھی قرآن سے قربانی کا حکم کیا معنی، جواز بھی نکلتا ہے، اگر کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ کی بھی فضیلت یا خیریت اس فعل کی طرف قرآن میں منسوب کی گئی ہے، تب بھی کیا قرآن اس الزام سے بچ سکتا ہے کہ وہ اس زمانہ کی ایک کتاب ہے جب تہذیب نے کافی ترقی نہ کی تھی اور وہ خدا کی کتاب نہیں بلکہ نعوذ باللہ ایک ایسے شخص کی تصنیف ہے جو بیسویں صدی کے مقابلہ میں چھٹی صدی کا ایک نیم مہذب انسان تھا؟

یہ نتیجہ ہے قرآن سے پہلے انسائکلوپیڈیا برٹانیکا کی طرف رجوع کرنے کا جس مقام سے آپ نے اپنی تحقیق کی ابتدا کی ہے اور جن مسلّمات کو لے کر آپ مسئلہ قربانی کی بحث و تنقیح کے لیے چلے ہیں وہ پہلے ہی قدم پر آپ کا قدم پھسلا کر کہیں سے کہیں لے جاتے ہیں۔ ان کا منطقی نتیجہ تو یہ ہے آپ قرآن کے کتاب اللہ ہونے سے انکار کر دیں لیکن چونکہ آپ کی عقل کے خلاف آپ کا وجدان اس کتاب پر ایمان رکھنے کے لیے اصرار کر رہا ہے اس وجہ سے آپ اس منطقی نتیجہ سے بچنے کی کوشش کر رہے ہیں اور قرآن کے ترجمہ و تفسیر میں حد تحریف تک پہنچی ہوئی تاویلیں کر کے صرف یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ قرآن

نے قربانی کا حکم نہیں دیا۔ حالانکہ اس سے وہ الزام جو خود آپ کے مسلّمہ اصول کی بنا پر قرآن کے خلاف عائد ہوتا تھا، صرف ہلکا ہو جاتا ہے، دور کسی طرح نہیں ہوتا، کیونکہ اس سے تو وہ صرف اُسی صورت میں بری ہو سکتا تھا جب کہ وہ قطعاً و ایجاباً قربانی بند کرنے کا حکم دیتا۔ یہاں پہنچ کر ہم پھر امرتسر کی "امّت مسلمہ" سے پوچھتے ہیں۔ الیس منکم رجل رشید؟

انسان کی پوزیشن اُس وقت بہت ہی عجیب و غریب ہو جاتی ہے جب وہ کسی سسٹم میں داخل بھی رہنا چاہتا ہو اور نظری و فکری حیثیت سے اس کا مخالف بھی ہو۔ ایسی حالت میں وہ اس سسٹم کی ہر چیز کو اپنے خلاف پاتا ہے اور اس کے ایک ایک تار کو ادھیڑ کر از سر نو بننے کی کوشش کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی نہیں چاہتا کہ اس ادھیڑ بن کا راز فاش ہو۔ اس لیے قدم قدم پر اس کو تاویل، تحریف، خدع اور فریب کے اوزار استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ عرشی صاحب ہم کو معاف فرمائیں اگر ہم عرض کریں کہ اس وقت وہ ایسی ہی مشکل پوزیشن میں ہیں۔ قربانی کے متعلق ان کا نقطۂ نظر وہ نہیں ہے جو اسلام کا نقطۂ نظر ہے۔ قرآن، حدیث، تفسیر، فقہ اور "سنت متواترہ" میں قربانی ایک عبادت کی حیثیت رکھتی ہے یہاں اس کی فضیلت اور خیریت کا تخیل ہے، اس کو ادا کرنے کے احکام ہیں، ان احکام کو بجا لانے کے قواعد مقرر ہیں۔ اس کے برخلاف آپ کے نزدیک وہ ایک مکروہ چیز ہے، جہالت ہے، اور ترقی تہذیب کی وجہ سے منسوخ ہو چکی ہے۔ اب آپ چاہتے ہیں کہ آپ کا یہ نقطۂ نظر اسلام کا نقطۂ نظر بن جائے اور سارے احکام اس کے مطابق ڈھل جائیں، لیکن ساڑھے تیرہ سو برس میں اسلام نے جس قدر لٹریچر پیدا کیا ہے وہ کل کا کل ایسے مواد سے بھرا ہوا ہے جو آپ کی اس غرض کے خلاف ہے، حتیٰ کہ قرآن کے صریح الفاظ بھی آپ کی اس غرض کے مخالف ہیں۔ آپ سنت متواترہ کو جہالت متواترہ کہہ کر ٹال دیں گے، حدیث، فقہ اور تفسیر کے سارے لٹریچر کو جعلی ٹھیرا دیں گے، مگر قرآن کی صریح آیات کا آپ کے پاس کیا علاج ہے؟ کن کن الفاظ کا مفہوم بدلیں گے؟ کن کن عبارتوں کو ادھیڑیں گے؟ کہاں تک خدا کے کلام میں اپنے معنی بھریں گے؟

عرشی صاحب نے قرآن میں معنوی تحریف کرنے کی جو حیرت ناک کوشش کی ہے اس کی صرف دو مثالیں ہم محض اس لیے پیش کرتے ہیں کہ شائد ہمارے اس بھٹکے ہوئے بھائی اور اس کے ہم خیال حضرات کو تنبّہ کی توفیق میسر ہو جائے۔

قرآن میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ حضرت ابراہیم نے خواب میں اپنے اکلوتے بیٹے کو ذبح کرنے کا اشارہ پایا تھا۔ اس کے امتثال میں وہ واقعی بیٹے کو قربان کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ جب انہوں نے اپنے لختِ جگر کو ماتھے کے بل پچھاڑ دیا تو اللہ نے فرمایا کہ یَا اِبْرَاهِیْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْیَا اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِیْنُ "اے ابراہیم تو نے خواب سچا کر دکھایا، ہم اسی طرح نیک بندوں کو جزا دیتے ہیں، بے شک یہ کھلی ہوئی آزمائش تھی"۔ اس قصے کا صاف مفہوم جس کو ہر صاحب فہم آدمی پہلی نظر میں محسوس کر سکتا ہے، یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیل کی آزمائش کرنی چاہی تھی، اس لیے بیٹے کو ذبح کرنے کا صریح حکم نہ دیا بلکہ کنایۃً خواب میں ایسا دکھایا کہ اپنے لختِ جگر کو ذبح کر رہے ہیں۔ حضرت ابراہیم چونکہ خدا کی محبت پر ہر محبت کو قربان کر دینے کا جذبہ رکھتے تھے، اس لیے وہ محبوب حقیقی کے محض اس ذرا سے ڈھکے چھپے اشارے ہی پر بیٹے کو ذبح کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ یہی اصل قربانی تھی، اور جب یہ پوری ہو گئی، تو اللہ تعالیٰ نے بیٹے کا خون بہانے سے ان کو روک دیا اور ایک "ذبح عظیم" کو اس کا فدیہ بنا دیا۔

غور کیجیے یہ کتنا عظیم الشان واقعہ ہے اور لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ کی روح کو کس شاندار طریقہ سے پیش کر رہا ہے۔ لیکن اب دیکھیے کہ عرشی صاحب اور ان کے ہم خیال حضرات محض "قربانی" کی مخالفت کی وجہ سے قرآن کے اس نہایت سبق آموز قصے کو کس طرح مسخ کرتے ہیں۔ ان کی تاویل یہ ہے کہ حضرت ابراہیم نے دراصل خواب کا مطلب ہی غلط سمجھا، جوش ایمانی تو ان میں ضرور تھا اور "شراب عشق کی سرمستی" تک پہنچا ہوا تھا، مگر فہم اتنی بھی نہ تھی جتنی عرشی صاحب

اور مولوی احمدالدین صاحب کو عطا ہوئی ہے وہ خواب کا مطلب یہ سمجھ بیٹھے کہ بیٹے کو ذبح کر دو حالانکہ درا صل ذبح کرتے ہوئے دکھانے سے خدا کا مقصد صرف یہ تھا کہ اس بچے سے دنیوی امیدیں منقطع کرکے اسے خدا کے دین کی عظیم خدمت کے لیے وقف کر دو۔ پس جب وہ اپنے لخت جگر کو پچھاڑ کر ایک ضرررساں غلطی کا ارتکاب ہی کرنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو متنبہ فرمایا۔ اور ذبح عظیم (یعنی بیٹے کو دین کے لیے وقف کرنے) کی طرف ان کی رہنمائی کی۔ اس تاویل میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا فرما کر خود تصدیق فرما دی کہ حضرت ابراہیم نے خواب کی تعبیر صحیح سمجھی تھی۔ فاضل مفسر نے اس رکاوٹ کو دور کرنے کے لیے آیت کے ترجمہ میں ایک ذرا سی تحریف کر دی۔ لفظی ترجمہ یہ تھا کہ "تو نے خواب کو سچ کر دکھایا" انہوں نے اس کا ترجمہ یہ کیا کہ "تو نے تو خواب کو سچ کر دکھایا" دیکھیے ایک چھوٹے سے لفظ "تو" نے مفہوم کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ جو تصدیق تھی وہ تعریض بن گئی۔ اس کے بعد اگر كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ کا فقرہ بے معنی ہو گیا تو کچھ پروا نہیں۔ رہا إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ الْبَلَاءُ الْمُبِينُ، تو اس نئی تاویل سے اس کے معنی یہ قرار پائے کہ یہ محض حضرت ابراہیم کی عقل کی آزمائش تھی کہ آیا وہ خواب کا مطلب صحیح سمجھتے بھی ہیں یا نہیں!

دیکھا آپ نے! محض ایک جزئی مسئلہ میں نقطۂ نظر کے پھر جانے سے انسان پر کس طرح بڑے بڑے مسائل میں فہم قرآن کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ جو واقعہ حضرت ابراہیم کا عظیم الشان کارنامہ تھا وہ ان کی ایک غلطی بن گیا۔ جس کو مسلمانوں کے سامنے اس لیے پیش کیا گیا تھا کہ وہ اسلام کی روح کو سمجھیں، اور اپنے اندر ایثار و قربانی اور محبت خداوندی کا یہ جذبہ پیدا کریں، اس کے مقصد کو قطعی باطل کر دیا گیا، اس کی جان نکال لی گئی، اور وہ محض اس امر کی ایک شہادت بن گیا کہ جلیل القدر انبیاء تک خدا کے اشارات کو نہیں سمجھ سکتے، بلکہ اس نعمت سے صرف بیسویں صدی کے ایک "مفسر اسرار" کو سرفراز فرمایا گیا ہے!

سورۂ حج کی ایک آیت جس سے صریحاً یہ ثابت ہوتا ہے کہ قربانی ایک عبادت ہے اور عبادت کا یہ طریقہ

اللہ نے ہر امت کے لیے مقرر فرمایا ہے، اس کی تحریف بھی ملاحظہ ہو۔ آیت کے الفاظ اور ان کا لفظی ترجمہ یہ ہے :۔

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ (رکوع ۵)

اور ہر امت کے لیے ہم نے مقرر کیا عبادت کا ایک طریقہ کہ وہ نام لیں اللہ کا اوپر اس کے جو بخشا ہے اس نے انکو چارپایوں میں سے

اس کا ترجمہ عرشی صاحب اس طرح فرماتے ہیں " اور دیکھو ہر امت کے لیے ہم نے عبادت کا طور و طریقہ ٹھیرا دیا کہ ہمارے دیے ہوئے پالتو چارپائے ذبح کرے تو اللہ کا نام یاد کرے"۔ دیکھیے لفظ "ذبح کرے تو" نے مفہوم کو کدھر پھیر دیا ہے۔ اب آیت کے معنی یہ قرار پائے کہ یہ جو مذبحوں میں روزانہ ہزاروں بکرے قصابوں کے ہاتھوں ذبح ہوتے ہیں؛ اور ان پر بسم اللہ اللہ اکبر پڑھا جاتا ہے یہی وہ منسک (عبادت کا طور طریقہ) ہے جو اللہ نے ہر امت کے لیے مقرر فرمایا تھا۔ اس قسم کی تحریفات کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کو اصل الفاظ میں محفوظ کرکے اللہ تعالیٰ نے ہم پر کتنا بڑا فضل فرمایا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو بعید نہ تھا کہ اس زمانہ میں انسائکلوپیڈیا برٹانیکا کو سامنے رکھ کر ایک نیا ہی قرآن تیار کر لیا جاتا۔

عرشی صاحب نے تقریباً تمام ان آیات کی ایسی ہی تاویلیں فرمائی ہیں جن میں قربانی کے احکام آئے ہیں، اور پھر فقہی مسائل کی ایسی توجیہات کی ہیں جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اصل مسائل کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی، بلکہ حدیث و تفسیر اور فقہ کی تمام کتابوں کے ورق الٹنے میں صرف ایک مقصد ان کے پیش نظر رہا ہے اور وہ یہ ہے کہ قربانی کی تائید میں اگر پہاڑ نظر آئے تو اس سے آنکھیں بند کر لیں، اور اس کے خلاف ایک بال کی ذرا سی نوک بھی نظر آئے تو اس کو پہاڑ بنا کر صرف ان مسلمانوں کے سامنے پیش کر دیں۔ جو بیچارے اصل ماخذ تک نہیں پہنچ سکتے، اور جن کے پاس یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں کہ ان نمائشی پہاڑوں کی حقیقت کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جہاں بحث کا یہ طریقہ اور تحقیق کا یہ معیار ہو وہاں کسی سنجیدہ بحث کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہو سکتی۔ اگر وہ چاہیں تو ان کی ایک ایک غلطی کا راز فاش کیا جا سکتا ہے، لیکن اس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا تا وقتیکہ وہ اپنی ذہنیت اور اپنے طریق فکر کی اصلاح پر آمادہ نہ ہوں۔

مشہور مستشرق ڈاکٹر گستاولی بان کی شہرۂ آفاق تصنیف

تمدّن عرب

جو

مدتوں سے نایاب تھی پہلے ایڈیشن ۱۸۹۸ء کی صفحہ بہ صفحہ جامع خصوصیات کے علاوہ
نواب جیون یار جنگ بہادر بی۔ اے بیرسٹرایٹ لا منصرم چیف جسٹس ہائی کورٹ حیدرآباد دکن کے
عالمانہ، بصیرانہ، ناقدانہ، مقدمہ اور فاضل مترجم

شمس العلماء ڈاکٹر سید علی بلگرامی

مرحوم کے جامع سوانح کے ساتھ نیز (۵) رنگین (۱۳۷) سادہ تصاویر (۳) نقشوں کے ہمراہ
جس کی قیمت پچاس روپے تھی مگر سو روپے میں بھی نہیں مل سکتی تھی۔ اب

اعلیٰحضرت فرمانروائے دکن مدظلہ

کے جشن سیمیں کی شادمانی میں اعظم اسٹیم پریس کی جانب سے شائع ہو چکی ہے
قیمت صرف پچیس روپے سنہری جلد خرچ ڈاک وغیرہ بذمہ خریدار

عبدالقادر

پبلیشر گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹر و پرائیٹر اعظم اسٹیم پریس چارمینار
حیدرآباد دکن
مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس چارمینار حیدرآباد دکن